تنظیم اسلامی پاکستان

A-67، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور، 54000
فون: 36316638، 36366638، 36293939 فیکس: 36313131
ای میل: markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مراکز حلقہ جات

حلقہ	فون	موبائل	ای میل
مالاکنڈ	0945-601337	0345-9535797	timergara@tanzeem.org
پشاور	091-2262902	0333-9244709	peshawar@tanzeem.org
اسلام آباد	051-4434438	0333-5382262	islamabad@tanzeem.org
راولپنڈی	051-4866055	0333-5567111	rawalpindi@tanzeem.org
مظفر آباد	0992-504869	0300-7879787	muzaffarabad@tanzeem.org
گوجر خان	051-3516574	0321-5564042	
گوجرانوالہ	055-3015519	0300-7446250	gujranwala@tanzeem.org
گلبرگ لاہور	042-35858212	0300-4708607	lahoreeast@tanzeem.org
سمن آباد لاہور	042-7520902	0323-8269336	lahorewest@tanzeem.org
عارف والا	0457-830884	0300-4120723	arifwala@tanzeem.org
فیصل آباد	041-2624290	0300-6690953	faisalabad@tanzeem.org
سرگودھا	048-3713835	0300-9603577	sargodha@tanzeem.org
ملتان	061-6520451	0321-6313031	multan@tanzeem.org
سکھر	071-5631074	0345-5255100	
حیدر آباد	022-2929434	0333-2608043	hyderabad@tanzeem.org
یاسین آباد کراچی	021-36311223	0300-2655625	karachinorth@tanzeem.org
سوسائٹی کراچی	021-34306041	0333-3503446	karachisouth@tanzeem.org
کوئٹہ	081-2842969	0346-8300216	quetta@tanzeem.org

تزکیۂ نفس

باب اول



تنظیمِ اسلامی

67۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔

فون: 36366638, 36316638, 36293939 فیکس: 36313131

ای میل: markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

نام کتاب .... تزکیہ نفس (باب اول)

تاریخ اشاعت (مارچ 2014ء) 1100

تاریخ اشاعت (جون 2014ء) 1100

ناشر .... شعبہ تعلیم وتربیت تنظیم اسلامی

مقامِ اشاعت .... A-67 علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور

مطبع .... جی ڈی ایس پرنٹرز بوتل بازار شاہ عالم مارکیٹ لاہور

فہرست

تزکیہ

ادب

انا

دیباچہ

ازروئے قرآن انسان کی نجات کا انحصار جہاں ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق وتواصی بالصبر (العصر:۱تا۳) پر ہے وہاں پر فلاح کو تزکیہ نفس سے مشروط کیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس:۹،۱۰)۔تزکیہ نفس کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین وشریعت کے غایت ومقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔خود نبی ﷺ کے مقصد بعثت یعنی غلبہ واقامت دین کو اگر قرآن میں تین مقامات (التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹) پر بیان کیا گیا ہے تو وہاں اس کام کے لیے افراد (صحابہ کرامؓ) کی تیاری کے لیے آپ ﷺ کے تربیت کا اساسی منہاج چار مقامات (البقرۃ:۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران:۱۶۴، الجمعہ:۲) پر پیش کیا گیا ہے جس میں تزکیہ نفس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

نبی ﷺ کے عمل تزکیہ کا نتیجہ صحابہ کرام کی جماعت میں بتمام وکمال نظر آتا ہے۔وہاں ایک طرف راتوں کے راہب ملتے ہیں تو دوسری طرف وہی دن کے شہسوار بنے ہوتے ہیں۔ہمارے دور تک پہنچتے پہنچتے جہاں دین اسلام کے دیگر تصورات مسخ ہوئے وہاں پر تزکیہ نفس کا بھی حلیہ بگاڑ دیا گیا جس کو علامہ اقبال نے ''خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات'' اور ''یہ مذہب ملا وجمادات ونباتات'' سے تعبیر کیا ہے۔جب سے تزکیہ نفس کے کام میں قرآن وسنت کی رہنمائی سے ہٹ کر غیروں سے مستعار تجربات اور خودساختہ طریق کار کو بنیاد بنانے کا رجحان شروع ہوا ہے اس وقت سے اس کے اندر بدعات وخرافات کے راستے کھل گئے۔اب تو ایک طبقے نے اسے باقاعدہ کاروبار کی صورت دے دی ہے اور اس سے وابستہ بیشتر لوگ تو بنیادی دینی علوم سے بھی بے بہرہ ہیں۔**اعاذنا الله من ذلك**

ایسے میں اشد ضرورت تھی کہ اس اہم ترین موضوع کو قرآن وسنت کی روشنی میں ازسرنو تازہ کیا جائے۔تزکیہ نفس کے مروجہ طریقوں میں درآنے والی خرابیوں کو واضح کیا جائے۔مزید برآں اس کے اصل مفہوم، مدعا اور طریق کار کو بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں شرح وبسط کے ساتھ دورحاضر کے محاورے کے مطابق پیش کیا جائے۔

تزکیہ نفس کا تقاضا دونوں مرد وخواتین سے ہے اور اس کی اہمیت دونوں کے لیے برابر اور مسلم ہے۔البتہ جہاں پر مردوں کو خطاب کے حوالے سے متعدد کتب دستیاب ہیں وہاں خواتین ،خصوصاً جدید تعلیم یافتہ خواتین کے لیے مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔

محترمہ ہما نجم الحسن صاحبہ نے اپنے طویل سلسلۂ بیانات بعنوان ''تزکیہ نفس'' میں بڑی تحقیق ومحنت اور لگن سے اس موضوع پر بات کی ہے۔ اگر چہ انہوں نے مروجہ تصوف پر براۂ راست کوئی تنقید نہیں کی اور نہ ہی ان طور طریقوں سے تعرض کیا جو فی الوقت تصوف کے حلقوں میں رائج ہیں۔ بایں ہمہ ان کے مثبت بیانات سے تزکیہ نفس کی اہمیت ،ضرورت اور عملی تدابیر اختیار کرنے کا احساس بخوبی پیدا ہو جاتا ہے۔

چونکہ وہ خود ایک خاتون ہیں۔انہوں نے عورتوں کے معاملات میں نہایت عمدگی سے تزکیہ نفس کی بحث کی ہے۔جس میں گھر میں اندرونی معاملات بیوی خاوند کا تعلق، اولاد کی تربیت، ساس وبہو، نند وبھابی کے تعلقات اور ان کی آپس میں تلخیوں اور دیگر امور کو بھی مثالوں سے واضح کیا ہے اور ان کا حل بتایا ہے۔ مزید برآں مروجہ معاشرتی رسومات جس میں عورتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے، اس تحریر کے ذریعے سے ان پر گہری تنقید کی ہے اور حل میں اسوۂ حسنہ کی تعلیمات واضح کی ہیں اور ایسے بہت سی اخلاقی کمزوریوں کا بیان ہے جس کو ہم اپنا حق سمجھ رہے ہوتے ہیں جب کہ وہ دراصل خیانت میں شمار ہوتی ہیں۔ ہماری ملازمات کے ساتھ برتاؤ یا سلوک میں خامیاں کوتاہیاں ہیں۔ان کو بھی عمدگی کے ساتھ مثالیں دے دے کر سمجھایا ہے۔

ان بیانات کو ہماری چند رفیقات نے بہت محنت ولگن سے محترمہ کی اجازت سے کیسٹ سے اتارا، اس کی درستگی کی اور بعد ازاں ہمارے ادارے انجمن خدام القرآن سندھ کے قرآن اکیڈمی یاسین آباد میں شعبہ تعلیم وتحقیق نے اس کی نوک پلک سنوارنے اور اس کی فنی editing کے مراحل طے کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش میں تمام رفیقات ورفقاء کی محنت کو شرف قبولیت بخشے اور ہم سب کو تزکیہ نفس مسنون طریقے سے اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

(ناظمہ علیا)

تنظیم اسلامی حلقہ خواتین

باب اول

تزکیہ

مفہوم اور مقصد:

تزکیے کے معنی ہیں کہ انسان بُرائیوں سے نجات حاصل کر لے اور اپنی اچھائیوں کو پروان چڑھائے۔ بنیادی طور پر تزکیے کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو گناہوں سے نجات مل جائے اور نیک کام زیادہ سے زیادہ کرنے لگ جائیں۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی دُعا کے الفاظ درج ذیل ہیں:

((اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنت خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلٰهَا))[۱]

''اے اللہ تو میرے نفس کو اُس کا تقویٰ عطا کر دے اور تو اس کو پاک کر دے، تو بہترین اس نفس کو پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا ولی ہے اور تو ہی اس کا مولا ہے۔''

تزکیے کے لئے کسی بھی زبان میں کوئی متبادل لفظ ڈھونڈنا آسان نہیں ہے، لفظ ''پاکی'' (Purity) بھی ایک محدود تصوّر دماغ میں لاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''صفائی'' سے بھی ایک محدود تصور ابھرتا ہے۔ لفظ تزکیہ اُن الفاظ میں سے محسوس ہوتا ہے کہ جن کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم اس بحث میں کسی دوسری زبان کا کوئی متبادل لفظ استعمال کرنے کے بجائے تزکیے کے لئے تزکیہ ہی کا لفظ استعمال کریں گے۔ اسی قبیل کا ایک اور لفظ ''تقویٰ'' ہے۔ اس لفظ کے لئے بھی ہم دنیا کی کسی اور زبان میں کوئی متبادل لفظ نہیں ڈھونڈ سکتے۔

نظامِ طہارت:

انسان جب اپنے چاروں سمت نظر دوڑاتا ہے، تو اس کا مشاہدہ اِس جانب رہنمائی کرتا ہے

---

(۱) مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل...

کہ ہر جاندار ایک ایسے نظام کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے جو اُس کے جسم کی اندرونی گندگی کو خود بخود صاف کرتا رہتا ہے، صحت مند جسم کے لئے یہ نظامِ صفائی نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی بہترین غذا استعمال کرتا ہو، لیکن اس کا نظامِ صفائی درست نہ ہو تو وہ صحت مند نہیں رہ سکتا، بہترین غذا کا استعمال بھی صحت مند زندگی کا ضامن نہیں۔ جہاں تک جسم کی اندرونی صفائی کا تعلق ہے، یہ خود بخود (automatically) ہوتی رہتی ہے، جبکہ جسم کو ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھنا ہر مخلوق کی اپنی ذمہ داری ہے، یہ عمل دو لحاظ سے ضروری ہے، اوّلاً صحت کے طبی اصولوں کے تحت (medical reason) اپنے آپ کو پاک و صاف رکھنا ضروری ہے اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو جمالیاتی (aesthetic sense) حس رکھی ہے، اُس حس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے آپ کو صاف رکھے چنانچہ انسان نہ صرف اپنے آپ کو صاف رکھتا ہے بلکہ زینت بھی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تقاضا انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ بے شعور جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے بچوں کو بھی ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھیں۔

ظاہری صفائی کا یہ عمل ایک دفعہ کے لئے کافی نہیں بلکہ خود کو مستقل صاف رکھنا مطلوب ہے جو کہ ایک مسلسل عمل ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ایک دن اپنے آپ کو صاف کر لیا تھا چنانچہ اب ایک ہفتے تک مجھے اپنے آپ کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک دن دانت صاف کر لئے تھے اس لئے اب ایک ہفتہ مسواک کرنے یا برش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، یا ایک بار میں غسل کر چکا لہٰذا اب ایک مہینہ مجھے نہانے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت انسان اپنے آپ کو صاف کرتا ہے، پھر کچھ نہ کچھ گندگی اُس کو لاحق ہو جاتی ہے جس کو دور کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یعنی اپنے ظاہری وجود کی طہارت ایک مسلسل عمل ہے۔

تزکیہ ایک مسلسل عمل:

ظاہری طہارت کی طرح تزکیہ بھی ایک مسلسل اور زندگی بھر کا عمل ہے۔ جیسے ظاہری صفائی حاصل کرتے ہیں، ساتھ ہی ہم دنیا کے کام بھی نمٹاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تزکیہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ

بندہ کہے کہ پہلے میں یہ کام کرلوں اور اس کے بعد زندگی کے باقی سارے کام شروع کروں گا۔ جیسے کہ روزمرّہ (routine) میں ہم صفائی کرتے ہیں اور باقی زندگی کے کام بھی کرتے رہتے ہیں اسی طرح تزکیہ کا عمل ہم باقاعدہ اپنی روزمرّہ زندگی کے دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ جاری رکھیں، جب تک ہم زندہ ہیں اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے یہ کوئی جُزوقتی کام نہیں ہے بلکہ زندگی بھر کا عمل ہے۔ تزکیے کا عمل ایسا نہیں ہے کہ چند دنوں میں یا چند سالوں میں اس کو مکمل کرلیا جائے، یہ محدود وقت میں مکمل نہیں ہوسکتا کیونکہ بندہ اپنا تزکیہ کرتا ہے تو کوئی اور بُرائی اس کے ساتھ شامل ہوجاتی ہے پھر اُس بُرائی کو دُور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور اگر کوئی بُرائی نہ بھی لگے تب بھی جب تک زندہ ہیں بُرائیوں سے پالا پڑنے کا امکان تو بہرحال موجود ہے، اسی لیے تزکیہ کا زندگی کے آخری لمحے تک مسلسل جاری رہنا ضروری ہے۔

گندگی کو دور کرنے کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ انسان کو گندگی کی پہچان ہو، پتہ ہو کہ یہ گندگی ہے، نجاست ہے اور اس بات کا احساس ہو، دوسرے یہ کہ اُس کے پاس ایسے ذرائع ہوں جن سے وہ خود کو پاک وصاف کرسکتا ہو۔ جب انسان کی ظاہری گندگی دُور ہوتی رہتی ہے تو وہ خود صحت مند رہتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے لئے اُس کا وجود خوش گوار ہوتا ہے۔ اُس کی موجودگی (presence) دوسروں کیلئے خوشگوار (pleasent) ہوجاتی ہے۔ لوگ اُس کی صحبت میں بیٹھتے ہوئے گھبراتے نہیں جبکہ گندے لوگوں کے پاس بیٹھنے سے گھبراتے ہیں۔ پاک وصاف لوگوں کے پاس بیٹھنا لوگوں کو اچھا لگتا ہے، خوشگوار لگتا ہے۔

یہاں تک جو معاملہ بیان ہوا وہ انسانوں اور جانوروں میں یکساں ہے، یعنی جسمانی اور ظاہری صفائی کا معاملہ مخلوقات میں یہاں تک مشترک ہے۔ پالتو جانوروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی گندگی کو کھود کر دبا دیتے ہیں، اپنے آپ کو مٹی میں لوٹ پوٹ کر صاف کرلیتے ہیں، اس سے آگے اب معاملہ مختلف ہوجاتا ہے، جانور تو صرف جسم کی ہی صفائی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ جانور نام ہی جسم کا ہے یعنی (جان + ور)، ان کے اندر کوئی اور جہت (dimension)، یا وجود کا کوئی اور طبقہ (level) ہے ہی

نہیں، جانور صرف جسمانی سطح پر زندہ رہتا ہے جبکہ انسان نرا جانور نہیں ہے، بلکہ اُس کے وجود کے کئی پہلو یا جہتیں ہیں۔ایک پہلو انسان کی سوچ (thought process) ہے جس کا تعلق ذہن سے ہے،ایک پہلو انسان کی روح ہے اور روح کا تعلق دل سے ہے۔

دل و دماغ کی طہارت:

انسان کو چاہئے کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کی طہارت کا بھی خیال رکھے۔تا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بھی صحت مند رہے۔اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پا کیزہ رکھنا دراصل صحت مند شخصیت کا راز ہے۔ جانوروں اور انسانوں میں فرق یہی ہے کہ جانور کی کوئی شخصیت (personality) نہیں ہوتی۔ اُسے اپنے ہونے کا احساس نہیں ہوتا جبکہ انسان کی ایک شخصیت(personality) ہوتی ہے،جس کا اُسے احساس بھی ہوتا ہے۔صحت مند شخصیت کے لیے اپنے جذبات اور خیالات کو پا کیزہ رکھنا ہوگا۔ اس طرح انسان خود اپنے لئے فائدے مند (productive) ہو جاتا ہے اور مخلوق سے بھی تعلق بہتر طریقے پر نبھاتا ہے۔ پُر وقار، خوش گوار شخصیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی ہوتا ہے۔عقیدے کو پاک رکھنے سے روح کو پا کیزگی حاصل ہوتی ہے، اس سے دلوں کو اطمینانِ نصیب ہوتا ہے۔ خالق سے درست تعلق کی بنیاد، درست اور پا کیزہ عقیدے پر منحصر ہے۔

تزکیہ کے چار پہلو:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق تزکیے کے چار پہلو ہیں۔ چار پہلوؤں سے انسان کو اپنی صفائی کرنے کی ضرورت ہے۔(۱) عقیدے کو شرک سے پاک رکھنا۔(۲) دل کو حسد، تکبر، نفاق وغیرہ سے پاک رکھنا۔(۳) جسم کو بُری حرکتوں سے پاک رکھنا۔(۴) لباس اور جسم کو گندگی سے پاک رکھنا۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پہلی دو باتوں میں انسان کو کامیابی مل جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ باقی دو خود بخود انسان کو حاصل ہو جائیں گی۔

تزکیہ کی شرائط:

عقیدے کو، سوچ کو، اعمال کو اور اخلاق کو پاک کرنے کی وہی دو شرائط ہیں جو جسمانی پاکیزگی کی ہیں۔ یعنی گندگی اور بُرائی کی پہچان ہو، احساس ہو اور دوسرے پاکی حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں کہ جن سے انسان اپنے آپ کو پاک کر سکے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، پہچان اور احساس، یہ انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (ingrained) ہے، جینیات (Genes) کے اندر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (الشمس: ۸)

''اللہ تعالیٰ نے نفس میں الہام کر دیا ہے اُس کا فسق و فجور اور اُس کا تقویٰ''۔

یہ چیز انسان کے اندر موجود ہے کہ وہ اپنی برائی اور اچھائی کو جانتا ہے۔

تزکیہ اندرونی حسن کا ذریعہ:

تزکیہ انسان کو داخلی طور پر خوبصورت اور حسین بناتا ہے۔ انسان فطرۃً حسن پسند واقع ہوا ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے ((اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ)) [۱] ''بے شک اللہ خوبصورت ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے''۔ انسان بھی خوبصورتی میں کشش (attraction) محسوس کرتا ہے۔ یعنی خوبصورت مناظر اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانی شکل وصورت کا تعلق ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے بنادی ہے، وہ ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن ہمارا باطن، سوچ، عقیدہ، دل اور ذہن کو خوبصورت بنانا ہمارے اختیار میں ہے۔ جو اپنی سوچ، عقیدے اور عمل کو خوبصورت بنالے وہ اللہ کی نظر میں حسین بن جاتا ہے۔ جناب نبی

(۱) مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

اکرم ﷺ دُعا فرمایا کرتے تھے، مسند احمد میں یہ دُعا موجود ہے:

((اَللّٰھُمَّ کَمَا اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ)) (۱)

''اے اللہ جہاں تو نے میری تخلیق خوب صورت کی ہے اللہ تو میرا اخلاق بھی خوبصورت کر دے''۔

اسلام کا تصورِ اخلاق:

ہمارے ہاں عام طور پر جو اخلاق کا تصور پایا جاتا ہے وہ اُس اخلاق کے تصور سے مختلف ہے جس کا ذکر ہمیں قرآن واحادیث میں ملتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے ہم اُس شخص کو خوش اخلاق کہتے ہیں جو باتونی ہو، جو لوگوں کو خوش کر سکتا ہو، جب وہ لوگوں کے درمیان موجود ہو، تو اُس کا اخلاق بہت اچھا ہو۔ یہ چند چیزیں ہیں جن کو ہم اچھا اخلاق کہتے ہیں یعنی ظاہری طرزِ عمل کو ہم اخلاق کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اس کا ظاہری معاملہ کیسا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اُس کے تصورِ اخلاق میں یقیناً یہ چیزیں بھی شامل ہیں کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا رویّہ کیسا ہے، دوسروں کے ساتھ اچھا خوشگوار رویہ رکھنا بھی اچھے اخلاق کا حصہ ہے۔ مگر یہ کُل اخلاق نہیں بلکہ اچھے اخلاق کا معیار اس سے کہیں زیادہ جامع (comprehensive) ہے۔ اس میں صحیح عقیدہ، نیت، دل کا خلوص، دل کی پاکیزگی بھی شامل ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کی دُعا جو مندرجہ بالا سطور میں درج کی گئی، اُس میں ظاہری اور باطنی تمام چیزوں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ دل کی صفائی، سوچ کی صفائی، دوسروں کے ساتھ اچھا رویہ، اللہ کے ساتھ اچھا رویّہ، دل کے اندر اخلاق اور خلوص ہو، بناوٹ نہ ہو، دورُخا پن نہ ہو، دوسروں کے ساتھ اچھا بننے کے لئے منافقت نہ کرنی پڑے۔ بلکہ جیسا انسان ظاہر میں دوسروں کو بہتر نظر آ رہا ہو، دل کے اندر بھی وہ ویسا ہی ہو۔ یہ ہے دراصل اسلام میں اچھے اخلاق کا تصور اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تو قرآن کی گواہی ہے۔

﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ (ن: ۴)

''اے نبی اکرم ﷺ بے شک آپ ﷺ تو اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں۔''

(۱) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اگر کوئی شخص دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتا ہے، تو اُس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت اچھا اخلاق ہے۔ اگر انسان بُرے اخلاق سے نجات چاہتا ہے اور اچھے اخلاق اپنانا چاہتا ہے تو اُس کے لئے کوئی ذریعہ بھی چاہیے۔

تزکیہ کے ذرائع:

اوپر ذکر آچکا کہ تزکیہ کی دو شرائط ہیں، پہلی شرط یہ کہ اپنی اصلاح کا احساس ہو اور دوسری شرط ذریعے کا حصول ہے جس سے تزکیہ ہو سکے۔ یاد رکھیں تزکیہ کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام، نبی اکرم ﷺ کے طور طریقے اور پاکیزہ لوگوں کے پاکیزہ کام اور باتیں ہیں، پاکیزہ صحبت بھی اس میں معاون ثابت ہوتی ہے، اس سے بھی انسان کا تزکیہ اور اصلاح ہوتی ہے۔ ان ذرائع سے انسان کی بُرائیاں دُور ہو جاتی ہیں اور اچھائیاں پروان چڑھتی ہیں، پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو کسی شے میں حُسن اُسی وقت آتا ہے جب اُس کے عیب دُور ہو جائیں اور خوبیاں نکھر جائیں۔ اگر کسی شے میں عیب موجود ہوں، گندگی ہو اور دوسری طرف کوئی خوبی بھی موجود ہو تو ہم اُس شے کو خوبصورت نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر کسی انسان سے بو آرہی ہو، جسم پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہو، بال بکھرے ہوں، ناخنوں میں میل ہو، دانت پیلے ہوں، لباس میلا ہو، اور وہ بہت خوبصورت زیور پہن لے، بہت قیمتی خوشبو لگا لے، انتہائی فیشن ایبل جوتے پہن لے تو ہم اس کو خوبصورت انسان نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر گھر گندہ ہو، بو آرہی ہو، کیڑے مکوڑے پھر رہے ہوں، دیواروں پر جالے لگے ہوں لیکن مہنگی مہنگی آرائشی چیزیں (decoration pieces) رکھی ہوں اور اُن پر بھی ڈھیر مٹی پڑی ہو تو ایسے گھر کو ہم خوبصورت نہیں کہتے، یہ زینت تو ہے مگر خوبصورتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس آپ کسی کے گھر جائیں جو بالکل سادہ ہو، قیمتی اشیاء سے تزئین و آرائش نہ کی گئی ہو لیکن وہاں اچھی طرح صفائی ہوئی ہو، سجاوٹ کی چیزیں سلیقے سے رکھی ہوں، تو ہم کہیں گے کہ یہ گھر خوبصورت ہے۔ تو خوبصورتی کے لئے بُرائیوں کا اور گندگی کا دُور ہونا اور ساتھ ساتھ (simultaneously) خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس دوہرے عمل (double process) کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ اس کے لئے اصطلاح مستعمل

ہے:"تخلّي عن الرزائل و تحلّي بالفضائل"۔ بُرائیاں دُور کی جائیں، اچھائیوں کو اختیار کیا جائے اور اُن کو پروان (encourage) چڑھایا جائے، اُن کی حفاظت (sustain) کی جائے تو انسان کے تزکیے کا عمل پورا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے اللہ کی مدد ورحمت بہرحال ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (النور: ۲۱)

”اے مسلمانو! اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی، تو تم میں سے کوئی ایک بھی، کبھی بھی پاک نہ ہوسکتا۔ لیکن اللہ پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے فضل ورحمت اور اُس کے کلام کے بغیر کوئی بھی پاکیزگی اور تزکیہ حاصل نہیں کرسکتا۔

مقاصدِ بعثت رسول ﷺ :

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ چار ہیں جو کہ یہ ہیں: تلاوت، تزکیہ، تعلیمِ کتاب اور حکمت۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْبَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(آل عمران: ۱۶۴)

”یقیناً اللہ نے بڑا احسان کیا مومنوں پر جب اُس نے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اُن کا تزکیہ کرتے ہیں اور اُن کو تعلیم دیتے ہیں کتاب اور حکمت کی“۔

یعنی نبی اکرم ﷺ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے تھے تاکہ اُن کا تزکیہ ہو اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے، اس سے پہلے تو یہ لوگ سراسر گمراہی میں تھے۔ ان کو پتہ ہی نہ تھا کہ پاکیزگی کیسے حاصل کی

جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى﴾ (طٰہٰ:۷۶،۷۵)

''اور جو اُس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کئے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لئے بلند درجے ہیں۔ سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔''

جنت میں جانے کے راستے:

جنت میں جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک بہت آسان، پُر تعیش اور لذتوں بھرا اور دوسرا مشقت والا جس میں قدم قدم پر آزمائشیں اور تکالیف ہیں۔ بعض لوگ پہلا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ بڑا خطرناک ہے، وہ دوزخ سے ہو کر جاتا ہے تو ایسا راستہ کیوں اختیار کریں جس میں اتنی مصیبت لاحق ہونے کا خطرہ ہو۔ دوسرا راستہ تھوڑا لمبا، طویل، مشکل اور کٹھن تو ہے مگر سیدھا جنت جاتا ہے۔ اس راستے میں بھٹکنے (detour) کی گنجائش نہیں ہے۔ تو کیوں نہ تھوڑی سی محنت و مشقت کر لیں اور براہِ راست جنت میں جانے کی کوشش کریں۔ اللہ بڑا مہربان ہے اُس سے امید رکھنی چاہئے کہ وہ ہمیں ضرور جنت میں پہنچائے گا۔ لیکن جنت نری تمناؤں اور خواہشوں سے تو ملنے والی شے ہے نہیں۔ صرف خواہشات (wishful thinking) سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے لیے مومن ہونا شرط ہے۔ ایمان لاؤ، پھر عمل صالح کرو؛ صحیح عمل اور سلامت عمل۔ اُردو میں ہم صحیح سلامت مکمل چیز کو کہتے ہیں۔ تو عملِ صالح کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان جو نیکی کرے اُسے مکمل کرے، ادھورے کام نہ کرے۔ اچھے اخلاق اختیار کرے۔ گھر والوں اور باہر والوں کے ساتھ، چھوٹے بڑوں کے ساتھ، سب کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے، اندر کچھ باہر کچھ یہ دوُرخا پن نہ ہو۔ دوسری چیز جو صالح عمل میں آتی ہے وہ یہ کہ اُس عمل کی حفاظت بھی کی جائے۔

نیکیوں کی حفاظت:

نیک عمل کرنا نسبتاً آسان ہے، لیکن اُس کو سنبھال کر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ نیکیوں کی اس طرح حفاظت کرنی ہے کہ وہ ضائع نہ ہوں، اُن پر گناہ کی گرد نہ پڑے۔ نفاق یا تکبر کا کیڑا نہ لگے جو ہماری ساری نیکیاں چٹ کر جائے۔ کہیں دکھاوے کا شکار نہ ہو جائیں لہٰذا انسان ایسے بڑے بڑے گناہوں سے بچے۔ اور کوشش کرے کہ دوسروں کی بُرائی نہ کرے۔ خدانخواستہ ہماری نیکیاں کسی اور کے کھاتے میں چلی جائیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ نیکیاں ہم نے کیں، شب بیداریاں ہم نے کیں، نوافل ہم نے پڑھے، صدقات ہم نے دیے مگر قیامت کے دن یہ نیکیاں اپنے اعمال نامے میں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن نہیں مل رہیں۔ پتہ چلا کسی نوکر کی دل آزاری کی تھی، ہمسائے کی ٹوہ لگائی تھی، رشتہ داروں کی غیبت کی تھی چنانچہ تمام نیکیاں اُن کے پاس چلی گئیں۔ چغلی، طنز یا غیبت ایسے اعمال ہیں جو ہماری محنت دوسروں کے نام کروا دیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی نفسیات یہ ہے کہ کسی نیک عمل کا اُس کو پتہ چلتا ہے تو بہت جوش و خروش سے وہ کام کرنا شروع کرتا ہے، دل جمعی کے ساتھ اس نیک کام کو کرتا رہتا ہے مگر آہستہ آہستہ اُس نیک کام سے اُس کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ایک اور نیکی پتہ چلتی ہے تو اب وہ پہلی والی کو چھوڑ کر دوسری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر کچھ دن اُس کا جوش و جنون چڑھا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک اور نیکی پتہ چلتی ہے۔ اب وہ دوسری چھوڑ کر تیسری شروع کر دیتا ہے۔ تو یہ طرزِ عمل تو نیکیوں کو پروان چڑھانا نہ ہوا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک باغ ہے اُس میں آپ نے ایک پودا لگایا اُس کی خوب حفاظت (care) کی جب وہ ہرا بھرا ہو گیا تو آپ نے ایک اور پودا لگایا، اب دوسرے پودے پر اتنی توجہ ہو گئی کہ پہلے کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو گئے۔ اور اُس کو نظر انداز (neglect) کر دیا۔ اب نہ پانی اور کھاد دیتے ہیں، نہ دیکھ بھال کرتے ہیں تو وہ مرجھا جائے گا۔ اور اگر آپ کی یہی روش رہی تو کبھی بھی مکمل باغ نہیں بن سکے گا۔ اسی طرح اگر پچھلی نیکیوں کو نظر انداز (neglect) کیے جائیں اور نئی نیکیاں کرتے چلے جائیں تو نیکیوں کا باغ نہیں لگ سکتا آپ کی زندگی میں نیکیوں کی بہار نہیں آسکتی۔ تو اسکے لئے پچھلی نیکیوں کی بھی حفاظت کرنی ہے، اور مزید نیکیوں کا بھی اہتمام کرنا ہے۔

جنت کے اعلیٰ درجات کا حصول:

جو انسان اپنا تزکیہ کرنا چاہے اور جنت کے اعلیٰ درجے حاصل کرنا چاہے، تو اُس کے لئے اہلیت، درست طریقہ اور شوق ہونا چاہئے۔ اگر شوق کے ساتھ اہلیت بھی ہو تو اس سے اچھا امتزاج (combination) کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ آج کل کہتے ہیں نا کہ بہترین کام (best job) وہ ہے جو آپ کا مشغلہ (Hobby) بھی ہو، تو اللہ کرے ہمیں اس بہترین کام (best job) کا شوق پیدا ہوجائے۔ سُستی اور غفلت کو چھوڑ دیں، مصلحتوں کو نظر انداز کردیں، بہت مفاد پرست (diplomatic) بن کر رہنا، سب کو راضی کرنے کی کوشش کرنا، یہ چیز بھی تزکیۂ نفس کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بہرحال فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لئے جنت تیار کی ہے جو خود کو پاک رکھیں اور اپنا تزکیہ کریں۔

اپنا تزکیہ کرنا دراصل خود کو جنت کا شہری بنانے کی کوشش ہے۔ یہ جنت کا شہری بننے کی مشق ہے جو ہمیں کرائی جاتی ہے۔ سورۃ الشمس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (الشمس : ۹)

''فلاح پالی اُس نے جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور ناکام اور نامراد ہوا جس نے اُسے آلودہ کیا''

تزکیہ اور اخلاق:

جس کا تزکیہ ہوگیا، وہ پاک ہوگیا، اُس کے اخلاق سنور گئے، وہ حسین ہوگیا۔ اللہ کو پاک صاف رہنے والے بہت پسند ہیں۔

﴿واللہ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبة:۱۰۸)

''اللہ پاک رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

احادیث میں اعلیٰ اخلاق حاصل کرنے کی بھی بڑی ترغیب آئی ہے۔ یعنی تزکیہ دراصل اعلیٰ اخلاق ہے۔ اعلیٰ اخلاق دراصل تزکیہ ہے۔ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے:

((إِنَّ مِنْ خِيَارِ كُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا))(۱)

''تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کے اخلاق بہترین ہیں''۔

ابوداؤداور ترمذی میں حدیث ہے۔حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا شَيْءٌ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ))(۲)

''قیامت کے دن مومن کی میزانِ عمل میں سب سے وزنی اور بھاری چیز جو رکھی جائے گی وہ اُس کے اچھے اخلاق ہوں گے''۔

موطأ امام مالک کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ))(۳)

''میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچادوں۔''

قرآن وسنت کے علم کی ضرورت:

خود کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے کے لئے انسان کو قرآن اور سنت کے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ علم انسان کے روحانی وجود کی پاکی کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ مادّی جسم کے لیے پانی۔ جب ہم پانی پیتے ہیں تو وہ جسم میں گردش (circulate) کرتا ہے۔جس سے جسم نرم رہتا ہے اور زہر یلے مادے جسم سے دُھل کر نکل جاتے ہیں، زندگی قائم رہتی ہے،صفائی کا عمل ہوتا رہتا ہے۔اسی طرح علم باطنی تزکیے اور صفائی کا سبب بنتا رہتا ہے۔اللہ کی آیات پڑھتے ہی تمام بُرائیوں سے نجات نہیں مل جاتی، بلکہ بُرائیاں دُور کرنے کی طلب پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح قرآن پڑھتے ہی انسان میں ساری اچھائیاں پیدا نہیں ہوجاتیں، بلکہ اچھائیاں حاصل کرنے کی طلب جنم لیتی ہے۔اور یہ طلب (urge) کہ مجھے اچھا بننا ہے یعنی اچھائیاں اچھی لگنے لگیں، بُرائیاں بُری لگنے لگیں اور یہ تڑپ پیدا

(۱)بخاری، كتاب المناقب،باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم

(۲)ترمذی، كتاب البر والصلة ،باب ما جاء في حسن الخلق

(۳)موطأ امام مالك، كتاب الجامع،وحدثني عن مالك انه قد بلغه...

ہو جائے کہ مجھے خود کو درست کرنا ہے، یہ طلب تزکیے کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہ طلب ہمارے اندر کلامِ الٰہی پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو پاک کریں، اپنی اصلاح کریں، ٹیڑھ سیدھی کرلیں اور قبلہ درست کرلیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منہ تو کھا کر فارغ ہو جاتا ہے لیکن نظامِ ہاضمہ (Digestive system) گھنٹوں غذا پر کام کرتا ہے۔ ہمارا نظامِ ہاضمہ (Digestive system) کتنی دیر تک غذا کو مختلف قسم کے مادّوں (Juices) کی مدد سے ہضم کرتا رہتا ہے تاکہ اِسے ہمارے جسم کا حصہ بنائے۔ اسی طرح گو کہ قرآن کو محدود مدّت میں پڑھا جاتا ہے مگر اُس کو جذب کرتے رہنا، اور اللہ کی آیات کو تزکیے کا ذریعہ بنانا مسلسل کرتے رہنے کا کام ہے۔ قرآن حکیم کو ہم اپنے حافظے (memory) میں محفوظ تو کر لیتے ہیں لیکن اس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے کے لئے سالوں درکار ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ پوری زندگی چاہئے۔ ہم سب اس راستے کے نئے نئے مسافر ہیں۔

تزکیے کی راہ میں احتیاط:

اگر ہم تزکیے کا عمل شروع کرنا چاہ رہے ہیں تو اس بارے میں محتاط روش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے اخلاقی عیوب یا بُرائیاں اُس کی روح پر زخم کی مانند ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے جسم پر چوٹ لگ جائے تو اسے صفائی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کے زخموں کو بھی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ ہر شے کی صفائی کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ کوئی برتن گندہ ہو جائے تو اُس کو سختی کے ساتھ مانجھا جاتا ہے۔ اب اگر اتنی ہی سختی کے ساتھ زخم کو صاف کیا جائے، اُسے رگڑا جائے تو کتنی اذیت اور تکلیف ہوگی اور زخم ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہو جائے گا۔ اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ''اے اللہ جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں ہمیں سختی کرنے کی ہمت دے اور جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں نرمی برتنا سکھادے''۔ شیخ حمزہ یوسف کہتے ہیں کہ جو اس راستے کا نیا نیا مسافر بنے اُسے ہوشیار رہنا چاہئے، خبردار رہنا چاہئے محتاط رہنا چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بہت زیادہ سختی نہ کرے۔ اور دوسری طرف اُسے یہ بھی احتیاط کرنی چاہئے کہ وہ فرائض میں کوتاہی کرنا شروع نہ کردے۔

"Beware of being extremely hard on yourself before

you obtain mastery over your self & beware of being too lax in any thing that concern sacred rulings."

انسان جب تزکیے کا عمل شروع کرتا ہے تو ہو سکتا ہے اُسے یہ خیال آئے کہ ابھی تو ہمارے اندر، ہماری نیت میں، خیالات میں اتنا بگاڑ موجود ہے تو پہلے ہم خود کو اندر سے ٹھیک کرتے ہیں، اُس کے بعد ہم شریعت کی ظاہری شکل پر عمل شروع کریں گے۔ یہ احکامات تو بعد کی باتیں ہیں ہمارے تو اپنے اندر بڑی گندگی ہے، پہلے اُس کو صاف کرلیں۔ یہ شیطان کی طرف سے ایک بہلاوا ہے۔ دراصل تزکیہ کوئی محدود وقت (time bound) کی چیز نہیں ہے، یہ پہلے یا بعد کا عمل نہیں ہے کہ پہلے ہم یہ کرلیں اور پھر بعد میں شریعت پر عمل کریں گے۔ دراصل جہاں شریعت کا حکم آئے گا اُس پر عمل ہوتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوں گی۔ اس لیے تزکیہ نفس بھی ساتھ ہی جاری رہے گا۔ اُن غلطیوں کی اصلاح کرتے جائیں گے اور شریعت پر عمل کرتے جائیں گے۔ یعنی یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ہیں۔

تزکیہ میں اعتدال اور حقیقت بینی کی اہمیت:

جب تزکیے کے نام پر احکامِ شریعت کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو بگاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی کوئی اس طرح سوچے کہ ابھی تو ہم غیبت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور بھی نہ جانے کتنے گناہ کرتے ہیں پہلے ہم ان سے نجات پالیں پھر ہم ظاہری احکامات پر عمل شروع کریں گے نماز پڑھیں گے، گھر سے باہر بھی باپردہ ہو کر نکلیں گے، گھر کے اندر کا پردہ بھی کریں گے۔ یاد رکھیں کہ یہ تزکیے کے راستے میں ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ ان دھوکوں سے بچنا ہے اور اپنے ساتھ نہ بے جا سختی کرنی ہے اور نہ بے جا نرمی۔ جہاں تزکیے کا عمل شروع ہوگا وہاں کئی اخلاقی عیوب سے سامنا ہوگا، ایسا محسوس ہوگا کہ ہر برائی ہمارے اندر موجود ہے۔ جیسے وہ طالب علم جو طب (medical) پڑھتے ہیں اور بیماریوں کی علامات (symptoms) انہیں پتہ چلتی ہیں تو بعض کا کہنا یہ ہے کہ ہر علامت (symptom) پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیماری میرے اندر موجود ہے۔ تزکیہ کا معاملہ بھی یہی ہے لیکن جہاں یہ چیز مفید ہے وہاں یہ چیز بعض دفعہ انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے، جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس لیے

ضروری ہے کہ مایوس نہ ہوں بلکہ تزکیۂ نفس کی طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں اور پھر اس کے بعد خود کو تھوڑا وقت دیں۔ آج ہی سے یہ سلسلہ شروع کر دیں۔ ان خرابیوں کو دور ہوتے ہوتے اور اندر سے نکلتے نکلتے وقت لگے گا۔ اور شعوری طور پر جان لیں کہ مکمل طور پر برائیوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہم سے فرشتہ بننے کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ ہم سے کہا گیا ہے کہ تم اپنا تزکیہ کرتے رہو۔ برائیوں پر ضرور نظر رکھو، انہیں پہچانو اور دُور کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَلاَ تُزَکُّوا اَنْفُسَکُمْ﴾ (النجم: ۳۲)

''اپنے آپ کو پاک مت سمجھو''

یعنی اپنی پاکیزگی کے دعوے مت کرو۔ انسان تو فطرۃً کمزور واقع ہوا ہے اور ایک حد تک ہی پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے لیکن اس میں احساس اور شعور ہونا چاہئے، شعوری طور پر اپنے آپ کو درست اور ٹھیک کرتا رہے۔ جب انسان اپنے لئے اس طرح کا مبنی بر حقیقت ہدف بناتا ہے تو اُس کے اندر نہ جھنجلاہٹ (frustration) پیدا ہوتی ہے اور نہ مایوسی اسے گھیرتی ہے۔

تزکیہ اور قرآن:

تزکیے کا عمل شروع کرنے کے لئے توانائی درکار ہوتی ہے۔ اللہ کی آیات پڑھ کر ایمان میں گرمی اور حلاوت آتی ہے، اسی کی مدد سے تزکیہ ہو سکتا ہے، جس طرح توا گرم کر کے روٹی ڈالیں تو صحیح پکتی ہے، نرم ہوتی ہے، مزیدار ہوتی ہے، صحیح آنچ لگتی ہے، خوب پھولتی ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈے توے پر روٹی ڈالیں گے تو کچی ہی رہے گی اور سخت ہو کر پاپڑ بن جائے گی۔ اسی طرح جب اللہ کی آیات سے دل نرم ہو جاتے ہیں تب تزکیے کا عمل شروع کیا جائے تو فائدہ مند رہے گا۔

معرفتِ انسان کی اہمیت

چونکہ تزکیہ کسی نفس کا ہوتا ہے اسی لیے اُس نفسِ انسانی کا ادراک بہت ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ جیسے کسی مشین کو کام میں لانا ہو تو اُس مشین کے بارے میں بنیادی معلومات ہونی چاہئے مثلاً اس کے کون کون سے حصے (parts) ہیں، کل پُرزے کتنے ہیں، ان کا آپس

میں ربط کیا ہے، کس طرح چلتے (function) ہیں، اسی طرح انسان کے بارے میں بھی یہ علم ہونا ضروری ہے کہ اسکی اصل حقیقت کیا ہے، اس کے مشتملات کیا کیا ہیں، کس حصہ کی کیا اہمیت ہے۔ اور اگر ہم اس مشین کو صحیح جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پتہ ہونا چاہیئے کہ اس کی قوت (potential) کیا ہے؟ اور یہ کیا کچھ کرسکتی ہے؟ اگر ہمیں کسی چیز کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا تو یوں سمجھیں کہ کسی کے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے لیکن وہ اسکی قدر و قیمت سے ناواقف ہے۔ اس کی قیمت (value) کا اندازہ ہی نہیں کہ میرے پاس جو ہیرا ہے یہ کوہِ نور ہے۔ جب وہ اسکی قدر و قیمت سے ناواقف ہوگا، اس کی اہمیت سے انجان ہوگا، اس کی حقیقت نہ جانتا ہوگا تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ محض ایک کانچ کا ٹکڑا ہے۔ وہ اس کو بیکار و بے وقعت سمجھے گا اور ہوسکتا ہے وہ اُسے کسی کچرے خانے میں پھینک دے یا کسی پالتو جانور کے گلے میں لٹکا دے یا کھلونا سمجھ کے بچوں کو دیدے۔ لیکن جو شخص اس ہیرے کی قدر و قیمت سے واقف ہوگا، اس کی اہمیت و حقیقت سے آشنا ہوگا تو وہ اُسے کسی بادشاہ کے حضور پیش کرے گا، کسی قدردان کے پاس لے کر جائے گا۔ بالکل اسی طرح اپنی ذات کو دُرست جگہ پر استعمال کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی غلامی اختیار کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی خدمت (serve) کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں۔ ہم سب کو پتہ ہو کہ میں کون ہوں؟ کس قابل ہوں؟ کیا میں حقیر سا کانچ کا ٹکڑا ہوں جس کو کسی جانور کے گلے میں باندھ دیا جائے؟ یا کھلونے کے طور پر برتا (treat) جائے؟ کیا میں جانوروں کی غلامی کے قابل ہوں؟ یا میں اعلیٰ وارفع ہوں، بہت قیمتی ہوں، انمول (master piece) ہوں، نایاب (unique) ہوں۔ اتنا اعلیٰ ہوں کہ کسی بادشاہ کا غلام بننے کے قابل ہوں تو جو قدر و قیمت ہماری اپنی نگاہ میں ہوگی اسی کے مطابق ہم فیصلہ کرینگے کہ ہمیں اپنی جبلّت کے تابع رہنا ہے یا اپنے روحانی وجود کے، کیا اس ہستی کی غلامی کروں جو میرا رب ہے، جو کائنات کا بادشاہ ہے یا دنیا کے مال و متاع کی، اپنے نفس کی؟ یہ فیصلہ تو اسی وقت ہو سکے گا جب مجھے اپنے بارے میں علم ہوگا کہ میں کون ہوں، میں کس قابل ہوں؟ خودشناسی (self recognition) خداشناسی (God recognition) میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اپنے رب کی معرفت بھی حاصل کرسکیں گے۔ اگر ہم

اپنے آپ کو نہیں پہچانیں گے تو اپنے رب کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔

انسان کے وجود کے کئی پہلو ہیں، کئی جہتیں (Dimensions) ہیں۔ ایک ہے انسان کی فطرت (Nature) جو کہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ سورۃ الروم آیت ۳۰ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ (الروم : ۳۰)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر کہ اللہ نے انسانوں کو بنایا ہے''۔

کچھ اقدار ایسی ہوتی ہیں جو انسان کسی کے سکھانے سے نہیں سیکھتا بلکہ سیکھا سکھایا دنیا میں آتا ہے۔ کچھ اچھائیوں کی پہچان اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ مثلاً توحید، حیا، اللہ کی فرمانبرداری کرنا فطرت میں شامل ہے، انسان کی فطرت (Nature) میں گندھی ہوئی ہے۔ علم کی طلب اور دوسروں کو سکھانے کا جذبہ (acquiring and imparting knowledge to others) بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ پھر اپنا محاسبہ (accountability) کرنے کا احساس بھی موجود ہے۔ بُرا کام کر کے گناہ کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان فطرۃً یہ احساس لے کر دنیا میں آتا ہے کہ یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے، یہ میرا دائمی ٹھکانہ نہیں ہے، یہ شعور انسان میں موجود ہے۔ اس حوالے سے سورۂ بقرہ آیات ۳۰ تا ۳۸ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان آیات میں تخلیقِ آدم کا قصہ بیان ہوا ہے، ان آیات پر تھوڑا سا غور و فکر (Meditate) کر لیا جائے تو بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ کچھ بُرائیوں کی پہچان بھی انسان میں فطرۃً موجود ہے۔ کوئی شخص کسی جنگل میں رہتا ہو، کبھی کسی نبی کی دعوت نہ سنی ہو، نہ دنیاوی تعلیم حاصل کی ہو۔ لیکن فطرۃً اسے معلوم ہوگا کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے، دھوکہ دینا بُری بات ہے، چوری کرنا بُری بات ہے۔

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (الشمس:۸)

''پھر اللہ نے الہام کر دی اس پر بدی اور پرہیزگاری''

چونکہ فطرت کے لحاظ سے ہر انسان مومن ہے لہٰذا مومن بننا کوئی مصنوعی (unnatural)

چیز نہیں۔ بلکہ پیدائشی طور پر ہر انسان مومن ہوتا ہے۔ دینِ فطرت لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ چاہے ہندو کے گھر پیدا ہوا ہو، عیسائی کے گھر، یہودی، آتش پرست یا بت پرست کے گھر پیدا ہوا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ)) (۱)

''ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو اُس کے والدین ہیں جو یا تو اُس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔''

یعنی فطرت کے اندر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ فطری طور پر انسانوں کے اندر یہ صلاحیت (potential) موجود ہے کہ وہ فرشتوں سے بڑھ کر مقام حاصل کر لے۔ یہ اُس وقت ہوگا جب کہ وہ اپنی فطرت پر قائم رہے۔ پھر ہی مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق ہوگا۔ سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین: ۵)

''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا ہے۔''

انسان کی فطرت:

فطرت کا تعلق روح سے ہے اور روح کا حُسن فطرت پر قائم رہنے میں ہے۔ روح صرف انسان میں ہوتی ہے، فطرت بھی صرف انسان کی ہوتی ہے، جانوروں کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ جو انسان فطرت کی سطح پر زندگی گذارتا ہے اُس کو دنیا میں چین نہیں آتا۔ وہ لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا چاہتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔ دراصل روح دنیا کی شے ہے ہی نہیں اسی لیے یہاں اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ روح لطیف شے ہے، یہ لوٹ کر اللہ کے پاس جانا چاہتی ہے، اللہ سے ملاقات کا شوق رکھتی ہے۔ دنیا میں اس کا دل نہیں لگتا تو جو فطرت پر زندگی گذارتے ہیں آخرت میں اُن کا نفس مطمئن رہتا ہے۔ سورۃ الفجر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(۱) بخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (الفجر: ٢٧،٢٨)

(نیک روح سے خطاب ہوگا) ''اے نفسِ مطمئنہ! واپس لوٹ اپنے رب کی طرف۔ تو اُس سے راضی، وہ تجھ سے راضی''۔

انسان کی جبلّت:

دوسری سطح ''جبلّت'' (instinct) ہے۔ انسان کی فطرت کی طرح اُس کی جبلّت بھی اللہ ہی نے بنائی ہے۔ کچھ افعال (actions) ایسے ہیں کہ جو انسان سیکھا سکھایا دنیا میں آتا ہے۔ کسی کو سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کو غذا کیسے حاصل کرنی ہے چنانچہ ماں کے جسم سے وہ اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ پھر خوف کا احساس ہے، بچے بھی خوف محسوس کرتے ہیں، ڈرتے ہیں، چونک جاتے ہیں یہ جبلّت کا تقاضا ہے۔ اپنی حفاظت کرنا، اپنی نسل آگے بڑھانا، یعنی بقائے نسل (preservation of species) اور بقائے ذات کے لئے جدوجہد کرنا بھی جبلّت میں شامل ہے۔ جہاں تک جبلّت کا تعلق ہے یہ انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے۔

جبلّت کا تعلق انسان کے حیوانی پہلو سے ہے۔ اس لئے اس کو حیوانی جبلّت (animal instinct) بھی کہتے ہیں۔ اب یہ جو انسانی وجود کی دو جہتیں (dimensions) ہیں، ''فطرت اور جبلّت''، ''روحانی وجود اور حیوانی وجود'' ان کے ملنے کی جگہ، دونوں کے ملاپ کی جگہ دل ہے۔ یوں سمجھیں کہ دونوں کی گرہ دل میں لگی ہوئی ہے، جب یہ گرہ کھل جاتی ہے تو دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے۔ روح جہاں سے آئی تھی وہاں لوٹ جاتی ہے۔ جسم مٹی سے بنا تھا اُسی مٹی میں مل جاتا ہے۔ جبلّت کی تمام ضروریات زمین سے پوری ہوتی ہیں۔ جب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں، تو خواہشات سر اُٹھانے لگتی ہیں اور شیطان انہی خواہشات پر کام کرتا ہے۔ دل میں دنیا کی محبت پیدا ہوتی ہے، خواہشات بڑھنے لگتی ہیں اور پھر یہ گناہوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا، جو فطری ضروریات تھیں وہ بھی پوری کیں۔ اُن کو علم دیا اور جو جبلّی ضروریات تھیں، اُن کا بھی اللہ نے بھرپور انتظام کیا۔ رہنے کو گھر دیا، کھانے پینے کو

بافراغت چیزیں مہیا فرمائیں، جسم ڈھانپنے کے لئے لباس دیا، ساتھی کے طور پر بیوی دی، یہی کچھ جبلّت کی ضروریات ہیں۔ پھر شیطان نے وسوسہ اندازی کی اور خواہشات کو اُبھارا۔ جب ضروریات پوری ہوگئیں تو خواہشات نے سر اُٹھایا اور اس حد تک خواہشات ابھریں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی۔

جبلّت کا تعلق جسم سے ہے اور جسم مٹی سے بنا ہے، جو لوگ جبلّت کی سطح پر زندگی گذارتے ہیں وہ دنیا سے جانا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں یہ بات فرمائی ہے کہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس کی زندگی اُس کو مل جائے۔ جبلّت انسان کو زمین سے بہت قریب کر دیتی ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت کو بالکل بھول جاتے ہیں، اسے نظر انداز (ignore) کرتے ہیں اور صرف جبلّت پر زندگی گذارتے ہیں تو وہ اُس کے غلام بن جاتے ہیں، زمین سے لپٹ جاتے ہیں۔ ﴿اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ﴾ (اعراف: ۱۷۶) اور ایک طرح سے وہ جانوروں ہی کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ان کا صرف حیوانی وجود زندہ رہ جاتا ہے، اُن کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک روح (divine spark) بھی موجود ہے جو روحِ ربانی ہے، اور ان کی اپنی فطرت بھی ہے، اس طرح ان کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔

انسانی عادات:

اب ایک طرف تو ہے فطرت، جو کہ انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور دوسری طرف ہے جبلّت جو کہ کمتر درجے پر ہے۔ اگر ہم صحیح ترتیب (order) بنائیں، تو یوں سمجھیں کہ فطرت حاکم (central authority) ہے۔ اُس کو حاکم ہونا چاہئے اور جبلّت معاونین (staff) کی طرح ہے، نوکر چاکر کی طرح ہے۔ ان دونوں کے بیچ ایک اور چیز ہے وہ ہے عادت۔ عادت یوں سمجھیں کہ رعایا کی طرح ہے، فطرت و جبلت میں سے انسان پر جس کی حکمرانی ہوتی ہے، رعایا اُس جیسی ہو جاتی ہے۔ اگر حاکم اچھا ہوتا ہے تو رعایا بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ اگر حاکم نیچ اور گھٹیا ہوتا ہے تو رعایا بھی گھٹیا حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ یہ تین درجے یا منزلیں ہیں۔ ایک طرف فطرت ہے، دوسری طرف جبلّت ہے۔ فطرت کا تعلق روح سے ہے اور جبلت کا تعلق جسم سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ (Body is a good

(slave but a bad master.) جو جبلّت کو حاکم (master) بنا دیتے ہیں، پھر وہ خیر حاصل نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے بیچ میں عادت ہے۔ ہم نے بات کی کہ فطرت اور جبلّت اللہ نے بنائی ہیں جبکہ عادتیں انسان خود بناتا ہے اور وقت کے ساتھ یہی عادتیں مل کر ہماری طبیعت بن جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں اُس کی طبیعت ایسی ہے۔ یہ عادتیں ہی مل کر طبیعتیں بنتی ہیں۔ شیطان عادتوں پر کام کرتا ہے، اور انسانی عادتوں کو پستی کی طرف گھسیٹتا ہے، جبلّت کی طرف لے جاتا ہے۔ کہتا ہے صرف اپنے حیوانی تقاضوں (animal instincts) کو یاد رکھو، اور حیوانی تقاضوں (animal instincts) کے تحت ہماری عادتیں بنانا چاہتا ہے۔ جب عادتیں جبلّت کے تابع ہو جائیں تو پھر انسان پستی میں گر جاتا ہے، عادتیں پست ہو جاتی ہیں۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ﴾ (التین: ٥)

''پھر اس کو پست سے پست کر دیا''

سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کا ذکر فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (الأعراف: ١٧٩)

''ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو کہ غفلت میں ہیں۔''

شیطان عادتوں پر کام کرتا ہے اُن کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ اور شریعت بھی عادتوں پر کام کرتی ہے، عادتوں کو بلند کرتی ہے اور اُن کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے، فطرت کے ماتحت کرنا چاہتی ہے، فطرت کے حساب سے عادتوں کو ڈھالنا اور بنانا چاہتی ہے۔ اسی لئے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ عادتوں کو جبلّت کے تابع کرنا شیطان کا کام ہے جو انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ عادتوں کو فطرت کے مطابق بنانا انسان کو اللہ کی طرف لاتا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات،

فرشتوں سے بھی اعلیٰ اوراحسن تقویم کے درجے پر لے جاتا ہے۔تو اصل چیزیں جوانسان کے اخلاق کو متعین(determine) کرتی ہیں اور انسان کے اخلاق کا فیصلہ کرتی ہیں وہ اس کی عادتیں ہیں۔ عادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اخلاق اچھا ہے یا بُرا۔اگر فطرت عادتوں پر حاکم ہے، عادتیں فطرت کے تحت ہیں تو اخلاق اچھا ہوگا، اگر عادتیں جبلّت کے تحت ہیں تو اخلاق بُرا ہوگا۔

فطرت اور جبلت با مقصد ہیں:

ایک بات یاد رکھیں کہ فطرت اور جبلّت کے اندر جو خصوصیات(qualities) ہیں ان میں سے کوئی چیز بے کار نہیں ہے اور نہ اپنی ذات میں بُری ہے۔جو چیز جس مقصد کیلئے بنی ہے وہ اس کے لئے ہی کام کر رہی ہے۔ جب وہ چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، تو پھر وہ بیماری اور نقصان کا سبب بنتی ہیں۔اور بیماری کے علاج کے لئے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیماری ایک بُرائی ہے، عیب ہے، بدصورتی ہے جبکہ علم خوب صورتی، اچھائی اور خوبی ہے۔

تناسب کی ضرورت:

ہم کسی شخص کو اُس وقت خوبصورت کہتے ہیں، جب اُس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ سب متناسب(balanced) ہوں۔تب ہم کہتے ہیں یہ شکل خوبصورت ہے۔اسی طرح اگر کسی کو اندرونی خوبصورتی حاصل کرنی ہے، حسنِ اخلاق حاصل کرنا ہے تو انسان کے اندر باطنی طور پر چار قوتوں کا متناسب(proportionate) ہونا ضروری ہے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق انسان کے اندر درج ذیل چار قوتیں ہیں:

1- قوت علم (Power of Knowledge)

2- قوت غضب(Power of Passion)

3- قوت شہوت (Power of appetites)

4- قوت عدل(Power of justice)

جب ان قوتوں میں توازن ہوتا ہے، تو انسان کا اخلاق اعلیٰ ہوتا ہے۔لیکن اگر یہ قوتیں غیر

متوازن ہو جائیں، کسی ایک انتہا (extreme) پر چلی جائیں تو یہ اخلاقی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے:

جس طرح جسمانی بیماری کا آغاز پہلے جسم کے اندرونی حصہ سے ہوتا ہے پھر اُس کی علامات (symptoms) خارجی طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے اور پھر اس کی علامات بُری عادتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، دل کو جسم اور روح دونوں لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ مختلف زبانوں میں کسی کے رویّے کو ظاہر کرنے کے لئے دل کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں سنگدل، رحمدل، دل کانپ گیا، دل چاہ رہا تھا۔ اسی طرح انگلش میں کہتے ہیں (hard heart ،heart felt ،heartless ،soft hearted ،cold hearted ،hearted went out) قرآن اور احادیث میں بھی دل کا بہت ذکر کیا گیا ہے۔

دماغ کے بننے سے پہلے ہی بچے کا دل ماں کے پیٹ میں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر دل اور دماغ کے سارے رابطے (connections) کاٹ بھی دیئے جائیں، پھر بھی دل دھڑکتا رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا سارا کام صرف دماغ کا ہے، صرف اُس کے پاس سوچنے کی صلاحیت (thought process) ہے۔ یہ خیال غلط ہے، دل بھی سوچتا ہے۔

تو یہ محض استعارہ نہیں ہے، کوئی محاورہ (proverb) نہیں ہے بلکہ آج سائنس نے بھی دل کا سوچنا ثابت کر دیا ہے کہ واقعی دل سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ دل کا اپنا ایک نظام (nervous system) ہے۔ دل میں تقریباً 40,000 (neurons) موجود ہیں۔ دماغ دل کو پیغامات پہنچاتا ہے اور دل دماغ کو، یعنی یہ دو طرفہ عمل (two way process) ہے۔ دل کی اپنی ذہانت (intelligence) ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)) (۱)

(۱) بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبراء لدینه

''جسم میں ایک گوشت کی بوٹی ہے جب وہ چیز ٹھیک رہتی ہے، پورا جسم ٹھیک رہتا ہے۔ اُس میں بگاڑ آ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے آگاہ ہو جاؤ، وہ دل ہے۔''

سوچ اور جذبے کے بگاڑ کا سبب فطرت اور جبلّت کا بگاڑ ہے:

جب دل میں بگاڑ آتا ہے تو دماغ تک اُس کا اثر جاتا ہے، انسان کی سوچ اور اُس کے جذبے بیمار ہو جاتے ہیں اور رویے میں اُس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ دراصل ہر بُری عادت، ہر گناہ کا بیج (origin) بگڑی ہوئی سوچ یا بگڑا ہوا جذبہ ہے۔

اس بگاڑ کی دو بنیادی وجوہات ہیں، ایک وجہ فطرت میں بگاڑ اور دوسری جبلّت میں بگاڑ ہے۔ فطرت میں شبہات (doubts) کی وجہ سے بگاڑ آتا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ فطرت بگڑنے نہ پائے۔ اسی لیے قرآن کا آغاز ﴿لاَ رَیْبَ فِیْهِ﴾ سے ہوا ہے یعنی ''اس میں کوئی شک نہیں''۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ﴿وَلاتَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ﴾ ''تم کسی شک میں مت پڑے رہنا''۔ اور ''مِرْیَةً'' بھی شک کو کہتے ہیں۔ یہ اس لیے ارشاد ہوا تاکہ انسان قرآن کے بارے میں کسی شک میں نہ رہے۔ فطرت کا بگاڑ ٹھیک کرنا بہت مشکل کام ہے لہٰذا فطرت کو ہر حال میں بگڑنے سے بچانا چاہیے۔ جبلّت کا بگاڑ آ جائے تو اس کو ٹھیک کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن اگر فطرت بگڑ جائے تو اُسے ٹھیک کرنا بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

جبلّت میں بگاڑ شہوات (appetites) کی وجہ سے آتا ہے۔ جب شہوات بے قابو ہو جائیں، شریعت کی حدود توڑنے لگیں تو جبلّت میں بگاڑ واقع ہو جاتا ہے۔ جائز خواہشات کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کی شریعت میں پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن جب یہ حدیں پار کرنے لگتی ہیں تو قرآن انہی خواہشات کے لئے ''ھواء'' کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی ایسی خواہشات جو کہ شریعت کی حدود کو توڑ کر پوری کی جائیں اور شریعت کا لحاظ نہ کریں، شریعت کے دائرے کے اندر مطمئن نہ رہیں، وہ خواہشات پھر بڑھ کر ''ھواء'' بن جاتی ہیں اور انسان شہوت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ قوت عدل، قوت علم بے قابو ہو جائیں، تو فطرت کے اندر شبہات آتے ہیں اور قوتِ غضب اور قوتِ شہوت بے قابو

ہوجائیں تو شہوات کو شہ ملنے لگتی ہے اور وہ بھڑ کنے لگتی ہیں۔

اللہ کا ذکر: دل کی اصلاح کا ذریعہ:

اگر کوئی دل کی اصلاح چاہتا ہے تو اللہ کی یاد اُس کا ذریعہ ہے۔ دل کی زندگی، اُس کا اطمینان اللہ کی یاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد: ۲۸)

''آ گاہ ہوجاؤ، اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

دل سلامت ہو تو یہ بڑی نعمت ہے، اس کا مطلب ہے کہ انسان کی فطرت سلامت ہے۔ اور ایسا دل قیامت کے روز سب سے قیمتی متاع ہوگا۔ سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (۸۸،۸۹)

''یہ وہ دن ہوگا جس دن کہ نہ مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔''

قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا:

﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الصّٰفّٰت: ۸۴)

''جب وہ آیا اپنے رب کے پاس قلبِ سلیم لے کر۔''

مومنین کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کا ذکر سن کر ﴿وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''ان کے دل کانپ جاتے ہیں''۔ اس کے برخلاف دنیا کی محبت دل کو بیمار کر دیتی ہے، بگاڑ دیتی ہے۔ قرآن میں ایسے بیمار دل کا بھی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ (البقرۃ: ۱۰) ''اُن کے دلوں میں مرض ہے۔''

﴿رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (المطففین: ۱۴) ''اُن کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے۔''

﴿تَعْمَى الْقُلُوْبُ﴾ (الحج: ۴۶) ''اُن کے دل اندھے ہیں۔''

﴿عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَقْفَالُهَا﴾(محمد: ٢٤) ''ان کے دلوں پر تالے پڑھ گئے ہیں۔''

﴿قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾(البقرۃ: ٧٤) ''تمہارے دل سخت ہو گئے۔''

یہ تمام خصوصیات جو ہم نے فطرت اور جبلّت کی بیان کیں، یہ سب اچھی چیزیں ہیں۔ بگاڑ اس طرح پیدا ہوا کہ لوگوں نے فطرت کو تو بہت اچھا سمجھا اور جبلّت کو بہت برا سمجھا۔ انھوں نے سوچا کہ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم جبلّت کے سارے تقاضوں کو مار ڈالیں۔ نفس کشی (self annihilation) کریں۔ جبلّت اگر کھانا مانگتی ہے تو کھانا مت دو، شادی بیاہ مت کرو۔ جسم آرام مانگتا ہے تو آرام مت دو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جب انھوں نے یہ سوچا تو تزکیے کا رُخ بالکل غلط ہو گیا، سوچ میں بگاڑ پیدا ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ تزکیے کا مطلب جبلّت کو مار ڈالنا ہے۔ لہذا تمام کوششیں غلط رُخ پر چلی گئیں۔ تمام توانائی غلط رخ پر صرف ہوگئی۔ جبلّت کو مار ڈالنا مقصد ہے ہی نہیں یہ تو اللہ نے ہمارے لئے بنائی ہے۔ حُسنِ اخلاق کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جبلت کو مار ڈالا جائے۔ کھایا پیا نہ جائے، نہ ہنسا بولا جائے، نہ لوگوں سے تعلق قائم کیا جائے اور نہ شادی بیاہ کی جائے۔

مندرجہ بالا سطور میں ذکر آچکا کہ فطرت کا تعلق روح سے ہے۔ اور روح تنہائی پسند ہوتی ہے، انسان اپنی فطرت کو سب سے اچھی طرح اُس وقت پہچانتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے۔ فطرت کو پہچاننے کیلئے بعض اوقات تنہائی بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک جبلّت کا تقاضا ہے اس میں انسان گھلنا ملنا چاہتا ہے۔ لوگوں کے اندر رہنا چاہتا ہے، معاشرتی روابط (social contact) چاہتا ہے۔ علمِ نفسیات (psychology) میں کہتے ہیں کہ انسان معاشرتی جانور ہے (Humans are social animals) تو جبلّت کے اندر یہ خاصیت ہے۔ انسان لوگوں کے درمیان بسنا چاہتا ہے، بات چیت کرنا چاہتا ہے یہ ہماری جبلّی خواہش ہے۔ ملنا جلنا انسان کی ضرورت بھی ہے لیکن غلو کرنے والوں نے یہ کہا کہ جبلت کو مار ڈالو، دبادو کسی سے ملنا جلنا نہیں، پہاڑوں میں، غاروں میں جا کر

رہو۔ آبادی سے دور دراز جا کر بسیرا کرو اور تنہائی اختیار کرو یہ درست نہیں۔ حُسنِ اخلاق حاصل کرنے کیلئے ان دونوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنا ضروری ہے۔ ان دونوں تقاضوں میں اعتدال قائم کرنا ضروری ہے اور دونوں کے تقاضوں کو تسکین فراہم کرنا ضروری ہے۔ جو فطرت کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے اور جو جبلی تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کیا جائے۔ دونوں کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں دونوں کیلئے گنجائش موجود ہے۔ فطرت کے تقاضوں اور جبلّت کی ضروریات دونوں کو شریعت پورا کرتی ہے، نہ صرف ضروریات بلکہ جائز خواہشات کو بھی پورا کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (اعراف: ۳۱)

''کھاؤ پیؤ لیکن حد سے مت بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

یعنی کھانے پینے کو مقصدِ حیات نہ بنا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم جبلّت پر اتنا دھیان (focused) دو کہ فطرت کو نظر انداز (neglect) کرنا شروع کر دو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))(۱) ''نکاح میری سنّت ہے''، یہ ثواب کا کام ہے، اللہ خوش ہوتا ہے نکاح سے۔ جہاں تک معاشرتی روابط (social links) کا تعلق ہے تو قرآن میں رحمی رشتوں کو نبھانے کا، غریبوں سے مسکینوں سے تعلق قائم رکھنے کا بہت تذکرہ ہے، اسلام کا معاشرتی پہلو (social component) بہت مضبوط ہے۔ باجماعت نماز کا نظام، زکوٰۃ کا نظام، حج کا عمل غرض ان عبادات میں میل جول ہے۔ اسلام کی تعلیم انسانوں سے کٹ کر بیٹھنے کی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی ہے۔ اسلام نے تو انسانوں سے رابطہ رکھنے کو عبادت قرار دیا ہے، لوگوں سے کٹ جانا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، اپنے نفس کو مار ڈالنا یا دبا دینا اسلام کا مقصد نہیں ہے۔ اگر آپ جبلّت یا فطرت، دونوں میں سے کسی

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح

ایک کو بھی نظر انداز کریں گے تو حسن اخلاق نہیں آ سکتا، انسان کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔

جبلت وفطرت کے توازن سے اندرونی وبیرونی امن:

ایمان امن دیتا ہے یہ چاہتا ہے کہ انسان کے دونوں پہلو فطرت اور جبلت کے درمیان امن (peaceful co-existance) ہو، دونوں کے حقوق اور ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اس سے انسان کے کُل وجود میں امن رہتا ہے، جب اندر امن آ جاتا ہے تو باہر بھی پُر امن فضا قائم ہو جاتی ہے۔ (Peace within is peace withbut) انسان پُر امن بنتا ہے، ایمان والا ہوتا ہے مومن ہوتا ہے تو خود بھی امن سے ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی باعثِ امن ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث اپنے سامنے رکھیں۔ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ))[1] ''مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں'' یہ ہے اسلام! یہ ہے سلامتی! جب انسان کے اندر سچا اخلاق ہوتا ہے تو وہ سچا مسلمان اور سچا مومن ہوتا ہے۔ خود بھی امن سے زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے دیتا ہے۔ اس کے اندر کوئی احساسِ محرومی (deprivation) نہیں ہوتی۔ غیر فطری پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، اس کے سارے فطری تقاضے اچھی طرح سے پورے ہو رہے ہوتے ہیں لہٰذا جب ان میں توازن (balance) قائم ہوتا ہے تو حسنِ اخلاق اور امن آ جاتا ہے۔

شیطان کے ہاتھوں فطرت وجبلّت میں بگاڑ:

شیطان جو کہ انسان کا ازلی دشمن ہے، اس کا چیلنج ہے کہ میں ان میں بگاڑ پیدا کروں گا۔ چنانچہ وہ ہم میں لازماً بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، جب فطرت یا جبلّت بگڑتی ہے تو فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایمان اور اسلام رخصت ہو جاتا ہے کفر آ جاتا ہے اور فسق آ جاتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین أصبعی الرحمن

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۹ میں شیطان کا یہ دعویٰ نقل ہوا ہے اس نے کہا تھا:

﴿وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾

''میں لازماً ان کو بہکاؤں گا، میں ضرور ان کو آرزوؤں میں الجھاؤں گا، اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا تو یہ میرے حکم سے چوپایوں کے کان کاٹیں گے، اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تبدیلی کریں گے۔''

فطرت اور جبلّت دونوں اللہ نے بنائیں، شیطان چاہتا ہے اِس کو بگاڑ دے لیکن وہ بگاڑ کا لفظ استعمال نہیں کرتا کیونکہ بظاہر ہمارا بڑا خیر خواہ بنتا ہے۔ بس یہ کہتا ہے کہ فطرت کے تقاضے پورے کرو، جبلّت کو دبا دو۔ یا کہے گا صرف جبلت پر نظر (focus) رکھو فطرت کو رہنے دو۔ فطرت میں شبہات کے ذریعے بگاڑ پیدا کرتا ہے جو بنیادی فطری چیزیں ہیں توحید، اللہ کی فرمانبرداری، خود احتسابی (accountability)، حیا، یہ احساس کہ دنیا میرا وطن نہیں ہے یعنی ان چیزوں میں شبہات پیدا کرتا ہے۔ کہتا ہے حیا کی تمھیں کیا ضرورت ہے؟ اللہ! وہ ہے بھی کہ نہیں؟ اللہ کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ فطری تعلیمات میں وسوسوں کے ذریعے شبہات پیدا کرتا ہے۔ قرآن ہمیں دینِ فطرت سکھاتا ہے۔ قرآن کا آغاز ہی ایسے ہوا: ﴿الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (البقرة: ۲) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔'' پہلے ہی شک کی نفی کر دی کہ تم تو فطرت سنوارنے اُٹھ رہے ہو شک سے نجات پالو اگر شک سے نجات نہیں پاؤ گے تو فطرت کے تقاضوں کو پورا (fulfill) نہیں کر سکو گے۔ ان کی تسکین نہیں ہو سکے گی۔ تم اپنی فطرت کو پہچان نہیں پاؤ گے تو شک سے نجات پانا ضروری ہے۔ شک ڈالنا شیطان کا بہت خطرناک ہتھیار ہے۔

اور جبلّت میں خواہشات اور شہوات (appetites) کے ذریعے بگاڑ پیدا کرتا ہے، برائیوں پر ابھارتا ہے۔ شریعت میں جبلّت کی جائز خواہشات کو پورا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ شیطان انہی خواہشات میں پھونکیں مارتا ہے، اور ان کو اتنا بڑھا دیتا ہے کہ پھر انسان شریعت کے دائرے

سے باہر نکل کران کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔اور جب یہ خواہشات شریعت کے دائرے سے باہر نکلنے لگتی ہیں تو ان کو قرآن ''ھَوا'' کہتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (٤٠) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (٤١)﴾ (النازعات)

''اور جو ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور اس نے اپنے نفس کو ھَوا سے روکا تو بیشک جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی قرآن میں یہ نہیں کہا کہ بندہ اپنی ساری خواہشات ختم کردے بلکہ ھَوا سے روکا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ (آل عمران:١٤)

''کھبا دی گئی ہے انسان کے دل کے اندر محبت شہوات کی یعنی عورتیں، بیٹے،خزانے،سونے چاندی کے نشان لگے ہوئے گھوڑے،جانور اور کھیتی۔''

ان تمام چیزوں کا شوق اور شہوت موجود ہے۔ان سے منع نہیں کیا گیا، کہ تم عورتوں سے محبت مت کرو یا عورتیں اپنے شوہروں سے محبت نہ کریں، یا اولاد کی خواہش ہی نہیں ہونی چاہیے، یا مال اچھا ہی نہیں لگنا چاہیے۔یہ سب جبلّت کے تقاضے ہیں۔انھیں پورا کرو لیکن ھَوا سے بچو اب اگر ہم اعلیٰ اور عمدہ اخلاق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو چار چیزیں بتائی ہیں،ان میں اعتدال پیدا کرنا ہوگا۔

بنیادی انسانی قوتوں میں اعتدال وتوازن:

قوّتِ علم،قوّتِ عقل،قوّتِ شہوت اور قوّتِ غضب کو اعتدال پر لانا ہوگا۔ان میں اگر کمی بیشی اور افراط وتفریط ہو جائے تو مختلف اخلاقی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور عمل میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے۔اب ذرا اس پہلو پر غور وفکر کر لیتے ہیں کہ جب یہ حد سے بڑھ جاتی ہیں تو کیا شکل اختیار کرتی ہیں؟ کس طرح سے ان کا اظہار ہوتا ہے؟ اور دوسری طرف اگر یہ نقطۂ اعتدال سے گر جائیں تو کونسی خرابیاں پیدا ہوتی

ہیں، اس کا اظہار کس طرح ہوتا ہے اور جب یہ قوتیں معتدل اور متوازن (balanced) ہوتی ہیں تو کیا شکل اختیار کرتی ہیں۔ انسان کے اندر کن چیزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اس پر تھوڑی سی بات کرتے ہیں۔

1: قوّتِ علم:

ایسا لگتا ہے کہ اس قوت کا تعلق فطرت سے ہے۔ علم حاصل کرنے کی طلب فطرت میں ہے۔ فطرت کی خصوصیات (ingrained qualities) انسانوں میں ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات جانوروں میں نہیں ہوتیں کیونکہ جانوروں میں فطرت نہیں ہوتی صرف جبلّت ہوتی ہے۔ (Nature is an exclusively human phenomenon.) فطرت کا تعلق چونکہ روح سے ہے تو یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جانوروں میں صرف جبلّت ہوتی ہے فطرت نہیں ہوتی۔ چونکہ جانوروں میں فطرت نہیں تو ان میں نہ انا ہے، نہ سوچ سمجھ ہے، نہ غور و فکر کی صلاحیت ہے، نہ حیا ہوتی ہے، نہ اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں، نہ پاکیزگی اور صفائی کا احساس (sense) ہوتا ہے، نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ہمارا گھر نہیں اور نہ علم ہی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سکھا سکتے ہیں۔ ہاں جبلّت کی سطح پر جن جن چیزوں کی ان کو ضرورت ہوتی ہے، وہ ان کے اندر موجود ہیں۔ گھر بنانا، گھونسلہ بنانا ان کی جبلّت میں پہلے سے موجود ہے۔ سُدھانا (tamed) اور چیز ہے علم سیکھنا اور ترقی کرنا دیگر چیز ہے۔ انسان غاروں میں رہتا تھا، علم حاصل کرتے کرتے فلک بوس عمارتیں (sky scrapers) بنانی شروع کر دیں۔ سفر کے لئے موٹر، ریل اور جہاز بنا ڈالے۔ لیکن چڑیا کا گھونسلہ دس ہزار سال پہلے بھی ایسا ہی تھا، آج بھی ویسا ہی ہے، اس میں ترقی نہیں ہوئی۔ دنیاوی ترقی (progress) علم کے حصول سے ہوتی ہے۔ لہٰذا فطرت والی خصوصیات جانوروں میں نہیں ہیں۔ انسان جب اپنی فطرت کو بھول جاتا ہے یا بگاڑ لیتا ہے تو بالکل جانوروں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس میں حیا ختم ہو جاتی ہے، اللہ کی طرف لوٹ جانے کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اپنے محاسبہ کا احساس، جوابدہی کا شعور نہیں ہوتا، اللہ کی فرمانبرداری کی طلب اور تڑپ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جانوروں کی سطح پر جیتا ہے، اپنی فطرت کا گلا گھونٹ کر اسے مسخ کر دیتا ہے، صرف اس کا حیوانی وجود بچتا ہے، اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں سے تشبیہ

دی ہے۔اندر کا انسان تو مر گیا ہے اب وہ صرف حیوانی سطح (animal instinct) پر زندہ ہے، صرف بھوک اور شہوت کے لیے زندہ ہے۔ بس یہی دو فکریں دامن گیر ہیں کہ پیٹ بھر جائے اور فرج کی تسکین کا سامان ہو جائے تیسرا کوئی مقصد بچا ہی نہیں۔ لہٰذا علم کا تعلق ہماری فطرت سے ہے۔

2: قوتِ عقل:

قوتِ عقل بھی انسان کے اندر ہے۔ جب یہ حد اعتدال سے بڑھ جائے، حدود سے متجاوز ہو جائے تو انسان کے اندر دھوکہ دہی، چالاکی، عیاری (evil genius) پیدا ہوتی ہے۔ سازشی و مکاری ذہانت نمو پا جاتی ہے۔ اور یہ ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر انسان اللہ کے علم پر شک کرنے لگتا ہے، اللہ کو اپنے سے بڑا ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ آخر کار اللہ کے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ ایسا کب ہوتا ہے؟ جب عقل میں زیادتی ہو جائے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کا زیادہ ہونا تو اچھا ہوتا ہے لیکن اگر آپ سرطان کی بیماری ذہن میں لائیں تو یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ ہمیشہ کسی چیز کا زیادہ ہونا فائدہ مند نہیں ہوتا۔ سرطان میں کیا ہوتا ہے؟ جیسے (cells) تیزی سے بڑھنا (multiply) شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کے جسم کے خلیے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو یہ بڑھوتری فائدہ تو نہیں دیتی بلکہ سرطان بن جاتی ہے۔ اسی طرح بے مقصد عقل و غیر نافع عقل جب حد سے زیادہ بڑھنے لگ جاتی ہے تو پھر وہ ایک مرض کی صورت اختیار کرتی ہے کئی اخلاقی بیماریوں کو جنم دینے کا باعث ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر قوتِ عقل میں بہت زیادہ کمی ہو جائے تو اس کا اظہار حماقت اور بیوقوفی (stupidity) کی صورت میں ہوتا ہے اور انسان اللہ کے ساتھ دوسری مخلوقات کو شریک کرنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح عقل جب کم ہوتی ہے تو انسان شرک کی طرف چلا جاتا ہے۔ اگر قوتِ عقل معتدل اور متوازن (balanced) رہے تو اس سے انسان میں حکمت و دانش (wisdom) جنم لیتی ہے۔ حکمت کا تعلق بھی فطرت سے ہے اور اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

3- قوتِ غضب:

کسی اور زبان میں اس لفظ کا متبادل ڈھونڈنا ممکن نہیں ہے، یوں سمجھیں جیسے کہ مشین کی طاقت (horse power) ہوتی ہے اسی طرح یہ انسان کا ایک انجن ہے، اس کا سرچشمۂ طاقت (source of energy) ہے۔ اگر قوتِ غضب زیادہ ہوگی تو آدمی بات کرنے میں بہت اونچا

اونچا بولے گا، بے ادب ہوگا، بڑے بڑے دعوے کرے گا، بڑھکیں مارے گا ضروری نہیں کہ قوتِ غضب کی زیادتی سے انسان میں یہ ساری کی ساری خرابیاں پیدا ہو جائیں۔لیکن ان میں سے کوئی ایک بُرائی بھی ہے تو وہ اسی قوت غضب کے اعتدال سے ہٹ جانے کی وجہ سے ہے چنانچہ قوتِ غضب کی زیادتی کی وجہ سے بڑے بڑے دعوے کرنا، بلاضرورت خطرات میں کود پڑنا، غصہ کرنا، جلد بازی کرنا، اوروں کی بے عزتی کرنے جیسی بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور اگر اس قوت میں حد سے زیادہ کمی ہوجائے، تو کاہلی پیدا ہوگی، سُستی (despondancy)، بزدلی اور کم ہمتی پیدا ہوگی، خود کو حقیر جانے گا، بے بسی کا شکار رہے گا۔شکوے شکایت کریگا۔اس کے اندر بے غیرتی پائی جائے گی یہ تمام برائیاں یا ان میں سے چند یا کوئی ایک پیدا ہوسکتی ہے اور اگر قوتِ غضب میں اعتدال ہے تو انسان کے اندر غیرت، خودداری اور شجاعت جیسی خوبیاں پیدا ہونگی۔

4- قوتِ شہوت:

خواہشات وشہوات (appetites ،desires) یہ سب ایک ہی قوتِ شہوت کے تحت آتے ہیں۔اگر یہ حد سے بڑھی ہوئی ہو تو لالچ، ہوس، بے حیائی، خیانت، بدعہدی، امیروں کے ہاتھوں ذلت اٹھانا جو معاشرے کے کرتا دھرتا ہیں ان کے آگے خوشامد اور چاپلوسی کرنا، غریبوں (have nots) کو حقیر جاننا، غیر حقیقی توقعات (unrealistic expectations) رکھنا۔اس طرح کی برائیاں پیدا ہونگی۔

اور اگر قوتِ شہوت حد سے زیادہ گھٹ جائے تو انسان کے اندر سستی پیدا ہوتی ہے، بے چینی رہتی ہے، جھنجلاہٹ اور مایوسی طاری رہتی ہے، انسان اعصابی دباؤ (depression) کا شکار ہوتا ہے۔لیکن اگر قوت شہوت اعتدال پر ہو تو انسان کے اندر عفت پیدا ہوتی ہے، تحمل آتا ہے، شرم وحیا قائم رہتی ہے، دوسروں پر کام کو آسان کرتا ہے، غیر حقیقی توقعات نہیں رکھتا، حقیقت پسند ہوتا ہے، ہوائی قلعے نہیں بناتا، اس کے اندر ظرافت ومزاح (sense of humour) ہوتا ہے، کسی کا مذاق نہیں اڑاتا، اس کے اندر توانائی (motivation) ہوتی ہے۔تو پتہ چلا کہ قوتِ غضب اور قوتِ شہوت کا گلا نہیں

گھونٹنا بلکہ ان کو معتدل کرنے کی اور کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے لٰہذا یہ قوتیں ہماری فطرت کے تابع ہونی چاہئیں۔

4- قوتِ عدل:

قوتِ عدل کا بھی تعلق فطرت سے ہے، جانوروں کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں ہے جبکہ انسانوں کے اندر عدل کا تصور ہے۔قوتِ عدل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دو انتہاؤں کی درمیانی کیفیت ہے۔عدل کی ضد ہے ظلم، چنانچہ عدل کے بارے میں انسان کا رویہ کبھی کبھی افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان عدل کے بارے میں زیادہ ہی حساس (sensitive) ہے تو بہت ہی زیادہ بال کی کھال نکالے گا، بہت ہی زیادہ محتاط ہوگا تو ظالموں کے ساتھ بے جا نرمی برتے گا۔ان کی طرف سے غلط اور جھوٹے بہانے قبول کرلے گا اس لئے کہ عدل کے بارے میں بڑا احساس ہوگا۔سوچتا رہے گا کیا پتہ ایسا ہو کیا پتہ ویسا ہو۔لٰہذا ظالموں کے ساتھ نرمی برتے گا ان کے غلط بہانے بھی مان لے گا اور عدل کے بارے میں اگر بہت دیر لگائے گا تو بھی ظالموں کو فائدہ ہوگا۔ہم کہتے ہیں نا! کہ عدل کرنے میں تاخیر کرنا ایسا ہے جیسا عدل کو روک لینا۔(Justice delayed is justice denied) اور اگر عدل کی طرف سے بالکل بے حس ہو، بے نیاز ہو، انتہائی غیر محتاط ہو، بہت جلد باز ہو تو بے قصوروں پر بھی شک کریگا۔بغیر ثبوت کے بھی لوگوں کو سزا دے دیگا۔اور اگر جلد بازی کریگا تو ہوسکتا ہے کہ بے قصوروں کو سزا دیدے تو دونوں صورتوں میں وہ ظلم کا ارتکاب کریگا۔

یہ چند باتیں ہیں کہ جن کا علم انسان کیلئے ضروری ہے تاکہ وہ خود کو پہچانے۔یہ تمام چیزیں انشاءاللہ خود شناسی میں مددگار اور معاون ثابت ہونگی۔اور خداشناسی کی طرف رہنمائی کریں گی۔

ادب

تزکیہ دراصل ہے ہی دل کو بدلنا۔ اور عربی میں لفظ قلب کا مطلب ہوتا ہے پلٹنا۔ اگر آپ نے اپنا تزکیہ کرنا ہے تو اس کا آغاز یقیناً دل سے کرنا ہوگا، دل سے ابتدا کرنی ہوگی۔ تزکیہ کے لیے اس دل کو سب سے پہلے آداب (etiquettes) سکھانے چاہئیں کہ مختلف لوگوں، مختلف ہستیوں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

پہلے زمانے میں جو استاد بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، ان کو مؤدِب کہا جاتا تھا یعنی ادب سکھانے والا، وہ بچوں کو متعلقہ علوم کے ساتھ ساتھ آداب بھی سکھایا کرتے تھے۔ لہٰذا علم کے ساتھ ادب آنا چاہیے۔

اللہ کا ادب:

سب سے پہلے جس کا ادب آنا چاہیے، وہ ہے ''اللہ کا ادب''۔ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے کیا آداب ہیں، اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، اس پر تھوڑی سی گفتگو کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ادب کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے ﴿لا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شيئًا﴾ (لقمٰن: ۱۳) ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو''۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیا جائے۔ یعنی متقی (God conscious) رہا جائے، خود کو اللہ کی نظر سے جانچا جائے۔ اللہ کی نظر سے تولا جائے، یہ اللہ کا ادب ہے۔ اللہُ اکبر! اللہ سب سے بڑا ہونا چاہیے۔ جو اللہ کا مقام ہے اسی پر اللہ کو رکھا جائے۔ تبھی اللہ کا ادب آئے گا اور اسکے مقام کا احساس ہوگا۔ نمازوں کے اندر خشوع و خضوع پیدا ہوگا۔

نماز میں اللہ کے سامنے بہت ادب کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔ سورۃ المومنون میں فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ (المومنون: ۰۲)

''وہ لوگ (فلاح پانے والے ہونگے) جو اپنی نمازوں میں خشیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔''

اپنے رب کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ تعلق کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ اُس کی

بہت تعریف کی جائے، اللہ کی تسبیح کی جائے یعنی سبحان اللہ اور اس کی تحمید کی جائے یعنی الحمد للہ، اس کا ذکر کیا جائے، اللہ کے بارے میں سوچا جائے، اس کی عظمت پر غور کیا جائے، اس کی خلاّقی پر غور کیا جائے اور حاصل یہ ہے کہ اللہ کو اپنی زندگی کا محور بنالیا جائے۔ ہم اُس کے نام سے جئیں اور اس ہی کے نام سے مریں۔

﴿اِنَّ صَلاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام: ۱۶۲)

''بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔''

یہ ہے للّٰہیت، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ﴾ (ال عمران:۷۹) ''اللہ والے بنو۔''

ایسے اللہ والے بنو کہ بس اللہ تمھارے دل پر چھا جائے، اُٹھتے بیٹھتے وہ یاد آئے اور اس سے محبت ہو۔ اللہ کے نام کا ادب کیا جائے، حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیئے کہ اگر کسی کاغذ پر لکھا ہوا اللہ کا نام زمین پر پڑا ہوا نظر آئے تو اُسے اٹھا کر اونچی اور محفوظ جگہ پر رکھ دیں، کچرے یا ردّی میں نہ جانے پائے۔ انسان اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں نہ کھائے، جھوٹی قسم کھانا تو پھر بہت بڑی بات ہے اللہ کے نام پر بہت زیادہ قسمیں کھانا بھی پسندیدہ نہیں۔ خاص طور پر اللہ کی قسم کھا کر کسی اچھے کام سے باز رہنا، کوئی اچھا کام چھوڑنے پر اللہ کے نام کی قسم کھالینا بے ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۴ میں فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ﴾

''تم اللہ کے نام کو نشانہ مت بناؤ اپنی قسموں کا کہ تم نیکی نہیں کروگے، تم تقویٰ نہیں کروگے، تم لوگوں کے درمیان اصلاح نہیں کروگے۔''

ایسی قسم مت کھاؤ کہ اللہ کی قسم میں زندگی بھر اپنے بھائی سے بات نہیں کروں گا، یا فلاں شخص کو کبھی سلام نہیں کروں گا نعوذ باللہ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

انسان بات بے بات اللہ کا نام نہ لے۔ شریعت موسوی علیہ السلام کے احکام عشرہ (ten commandments) میں بھی یہ بات رقم ہے کہ لغو چیزوں کے لئے اللہ کا نام مت لیا

کرو۔(Do not take the name of God in vain)، گناہوں پہ اللہ کا نام مت لیا کرو۔ اللہ کا نام ادب اور شعور (conscious) کے ساتھ لینا چاہیئے۔

اللہ کے نام کا ادب یہ بھی ہے کہ اللہ کے ناموں کو اپنی دعاؤں کے لئے وسیلہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰)

''تمام خوبصورت نام اللہ کے لئے ہیں، تو اس کو ان ناموں سے پکارو۔''

انسان اپنی طرف سے اللہ کا نام ایجاد نہ کرے بلکہ اللہ نے قرآن مجید میں اپنے جن صفاتی اسماء کا تذکرہ کیا ہے یا احادیث میں جو نام مذکور ہیں بس انھیں صفاتی ناموں کے ذریعے اللہ کو پکارے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا میں یہ الفاظ آتے ہیں:

((لا اُحصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِك)) [۱]

''اے اللہ میں تو تیری تعریف بھی نہیں کرسکتا، تُو تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف فرمائی۔''

ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی طرف سے کوئی اچھا نام لیکر اللہ تعالیٰ کو پکاریں لیکن وہ اللہ کے شایانِ شان نہ ہو اس لئے کہ اللہ تو اکبر ہے، اللہ بہت بلند مرتبہ والا، بہت اعلیٰ ہے، ارفع ہے، وہ ممّرا اور منزّہ ہے، ہمارے تصوّرات سے بہت ماوراء ہے۔ ہم اپنے معیارات سے سوچتے ہیں اور ہمارے معیارات بہت چھوٹے ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات تک ہمارے وہم و گمان کی رسائی نہیں ہوسکتی، ہمارا تخیل (imagination) بھی اللہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے کوئی نام یا صفت گھڑ لے یا اللہ کے بارے میں کوئی تصوّر قائم کرلے۔ اللہ کا ادب یہ ہے کہ جن ناموں سے اللہ نے خود کو یاد کیا ہے انہیں کو وسیلہ بنایا جائے۔ جب دل میں اللہ کی عظمت ہوگی تو اس کا اثر عمل میں نظر آئے گا پوری شخصیت پر اس کا اثر ظاہر ہوگا اور اس کی صفات کی عظمت کا یقیناً احساس ہوگا۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات عن الرسول اللہ ﷺ

قرآن کا ادب:

قرآن کریم اور وہ مجلس جہاں قرآن پڑھا جارہا ہو، دونوں کے آداب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الاعراف: ۲۰۴)

"جب قرآن پڑھا جارہا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

یہ ہے قرآن سننے کا ادب۔ سننے سے مراد ہے اس خاص مجلس میں سننا، جہاں انسان آتا ہی قرآن سننے کیلئے ہے۔ ورنہ اگر بیچ بازار میں تلاوتِ قرآن کی آواز آرہی ہے تو انسان بازار میں قرآن سننے کے لئے تو نہیں گیا۔ اب اگر وہاں کسی نے تلاوت کی کیسٹ لگا رکھی ہے تو جس نے تلاوت لگائی ہے وہ ادب سے سنے، باقی لوگ اس کے مکلف نہیں۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جب تم قرآن کی مجلس میں آؤ۔ تمھارا ارادہ ہی یہ ہو کہ تمہیں قرآن سننا ہے یا پھر تم خود اس ارادے سے کیسٹ لگاؤ کہ مجھے قرآن سننا ہے تو اب خاموش رہو اور غور سے سنو۔ جہاں قرآن پڑھا جارہا ہو وہاں باادب بیٹھنا اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ ترتیب کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے، بے دلی سے نہیں سننا چاہیے، دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھ کر سننا چاہیے۔ کیونکہ قرآن تو نازل ہی دل پر ہوا ہے۔ اگر دل غافل رہے، بےادب رہے تو اصلاح کا آغاز کہاں سے کریں گے۔ لہٰذا مؤدّب بننے کا آغاز دل سے کرنا ہے سب سے پہلے دل کو ادب سکھانا ہے، قرآن سنتے سنتے جمائیاں لینا، اونگھنا یا سوجانا انتہا درجے کی بےادبی ہے۔ کسی درس وغیرہ میں جانا اور وہاں قرآن کی آیات کا درس ہورہا ہو تو متوجہ ہو کر سننا بہت ضروری ہے۔ ذرا سوچیں ایک طرف قرآن سنایا جارہا ہو، پڑھایا جارہا ہو اور دوسری طرف ہم موبائل پر پیغامات (messages) بھیج رہے ہوں، پڑھ رہے ہوں یا فون پر باتیں شروع کردیں، یہ سب کتنی بڑی بےادبی ہے۔ مثل مشہور ہے "باادب بانصیب بے ادب بےنصیب"۔ جو اتنی بےادبی سے اللہ کا کلام سنے گا تو خدشہ ہے کہ وہ ہدایت سے محروم رہے، قرآن اس کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ اتنی لاپرواہی کے ساتھ قرآن سننے والے کو ہدایت کہاں سے ملے

گی تو یہ رویہ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔اسی طرح قرآن کی مجلس میں بیٹھے ہیں، باتیں تو نہیں کر رہے لیکن کاپی پر لکھ کر ایک دوسرے کو بھیج رہے ہیں یہ بھی انتہائی وبال کا باعث ہے اور سخت بے ادبی ہے۔

اس لئے جس حد تک ممکن ہو اپنے جسم سے، اپنی سوچ سے، اپنے دل سے اور حرکات وسکنات سے قرآن کا ادب کرنا چاہیے۔ کلام کا ادب ظاہر کرے گا کہ صاحب کلام کا کتنا ادب دل میں ہے۔اور اللہ سب سے زیادہ اس ادب کا مستحق ہے۔

جناب رسول اکرم ﷺ کا ادب:

اللہ کے شرف کے بعد انسانوں کا مرتبہ آتا ہے۔ یقیناً انسانوں میں سب سے اشرف اور ارفع نبی اکرم ﷺ ہیں۔اس لئے سب سے زیادہ آپ ﷺ کا ادب کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (١) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (٢)﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور باخبر ہے۔اے ایمان والو! اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ ان سے ایسے زور سے بولو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔''

جب نبی اکرم ﷺ کا نام آئے تو چاہئے کہ درود پڑھے جب آپ ﷺ کی حدیث شریف سامنے آجائے تو خاموش ہو جائے، کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہے کسی نے کہا بھئی حدیث میں یہ آتا ہے۔ بس بات ختم، طے (decide) ہو گیا۔آپ ﷺ کی بات کے سامنے اپنی آوازوں کو بلند نہیں کرنا۔ نبی اکرم ﷺ کی سنتوں کا احترام کرنا ہے۔جب آپ ﷺ کا ادب ہو گا تو آپکے طور طریقوں کا بھی ادب ہو گا اور آپ ﷺ تو تھے ہی افضل البشر، بہترین انسان، آپ ﷺ تو امام الانبیاء ہیں، آپ ﷺ نے معراج کے

موقع پر تمام انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھائی۔ خلاصہ یہ کہ ہر سنت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی اُسکا ادب کرنا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جتنے لوگ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سب کا احترام نہایت ضروری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جب تمہارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جائے تو ادب کے ساتھ خاموش ہو جاؤ، یعنی اُن پر طعن وتنقید مت کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھی، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیارے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج تھیں، جن کو ازواجِ مطہرات کہا گیا یعنی پاک بیویاں۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار جو ایمان لائے، اُن سب کا لازمی ادب کیا جائے، اُن کی عزت کی جائے۔ اور وقت نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ جتنا زیادہ ہم ان کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اُتنا ہی زیادہ اُن کا ادب بھی کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ!!

انسانوں کا ادب:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بعد عام انسانوں کی باری آتی ہے۔ اُن کا ادب بھی ضروری ہے۔ جو علم میں بڑا ہو اُسکا ادب کریں چاہے کوئی استاد ہو یا کوئی عالم ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی عمر میں بڑا نہ ہو مگر علم میں بڑا ہے اُس کا ادب کرنا چاہیے۔

عمر میں بڑوں کا ادب:

عمر میں بڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خاندان کے بزرگ، نانی، دادی، چچا، تایا، پھوپھیاں، ساس، سُسر۔ یہ عمر میں بڑے لوگ ہیں ان کا ادب کرنا نہایت ضروری ہے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ بڑوں کے سامنے زبان چلائے۔ یہ روش پُر اعتمادی (confidence) کی علامت نہیں ہے بلکہ بدتمیزی (defiance) کی علامت ہے۔ خاندان کے بزرگوں کا ادب لازمی ہے۔ یعنی ان سے جھک کر ملا جائے، اُنہیں سلام کیا جائے، کوئی بات اُن کے سامنے ایسی نہ کی جائے جس سے وہ اپنی بے

عزتی اور بے ادبی محسوس کریں۔

دوسرے وہ عمر رسیدہ لوگ جو خاندان کے بزرگ یا رشتہ دار نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے ملازم ہوں ڈرائیور، آیا، خانساماں، چوکیدار یا جھاڑو پونچھا کرنے والے ہوں۔ اگر یہ ملازمین عمر میں بڑے ہیں تو اُن کا ادب کرنا چاہئے۔ حدیثِ رسول ﷺ میں آتا ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا))(۱)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور وہ ہمارے بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا۔''

بچوں کو خادمین کا ادب کرنا سکھایئے:

اپنے بچوں کو سکھایئے کہ نوکروں کا ادب کریں کیونکہ وہ اُن سے بڑے ہیں۔ اُنہیں ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرنا ہے۔ بچے عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں اور ملازمین عام طور پر عمر میں اُن سے بڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں سکھائیں کہ ملازمین سے تحکمانہ لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے۔ بچے نوکروں کو خود سلام کریں اس لئے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کرتے ہیں تو جہاں خاندان کے بزرگوں کو سلام کرنا ہے وہاں گھر کے نوکروں کو بھی سلام کرنا لازمی ہے۔ اس لئے کہ ملازمین کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے۔ وہ بھی عزت چاہتے ہیں۔

جب ہم چاہتے ہیں کہ بڑے ہماری اطاعت کریں، ہمارا کہنا مانیں تو ہم خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں۔ بلاوجہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیتے ہیں۔ اللہ نے ہم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ ہم سب کو اپنا مطیع بنائیں۔ بعض دفعہ فرمانبرداری کرنا، کسی کی بات ماننا، احکام بجالانا ہمیں بہت پرسکون کر دیتا ہے، ہلکا کر دیتا ہے۔ اگر ہمیں اچھا معیارِ زندگی (quality of life) چاہیے تو ہم ادب کر کے دیکھیں۔

---

(۱) مسند احمد، بَاقِي مُسْنَدِ المُكْثِرِينَ، مُسْنَدُ أَبِي سَعِيدِ الخُدْرِي

عہدے میں بڑوں کا ادب:

پھر جو عہدے میں بڑا ہو اس کی بھی عزت کرنی چاہیے کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔مثلاً ملک کا سربراہ، کسی ادارے کا سربراہ، جج، مسجد کا امام یا کوئی استاد ایسے تمام افراد کی عزت کرنی چاہئے۔

رتبے میں بڑوں کا ادب:

بعض لوگ رُتبے میں بڑے ہوتے ہیں جیسے والدین۔اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت بڑا رتبہ دے رکھا ہے۔اسی طرح مالک ہوسکتا ہے کہ عمر میں چھوٹا ہو لیکن اللہ نے اسے ایک مقام عطا کیا ہے کہ اسے مالک بنادیا تو جو ماتحت ہیں وہ مالک کا ادب اور اس کی عزت کریں۔ادب میں لازماً یہ بات شامل ہے کہ جو بڑے ہیں چاہے علم میں ہوں یا عمر میں، عہدے میں ہوں یا مرتبے میں، اُن کا ہرگز مذاق نہ اُڑایا جائے۔ ہمارے ہاں جو رواج چل پڑا ہے کہ عہدے میں بڑے لوگوں کے مزاحیہ کردار (caricature) بنائے جاتے ہیں، اُن کی کردار کشی کے لیے لطیفے گھڑے جاتے ہیں یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں جو کہ آئیڈیل اسلامی معاشرہ تھا، ہمیں اس طرح کی باتیں نہیں ملتیں۔کوئی کسی کا اس طرح مذاق نہیں اُڑایا کرتا تھا، مذاق اڑانے سے تحقیر ہوتی ہے، بے عزتی ہوتی ہے جو کہ ادب کی ضد ہے۔لیکن ہمارے ہاں میڈیا نے یہ رواج (culture) اپنالیا ہے کہ ملک کے صدر کا مذاق اڑایا جائے، وزیروں کا مذاق اُڑایا جائے یا ادارے کے سربراہوں کا مذاق اڑایا جائے اور اس سے لطف اندوز ہوا جائے۔

علم ادب کے ساتھ آتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ علم کے ساتھ ادب آنا چاہیے۔دونوں چیزیں لازم اور ملزوم ہیں۔علم اور ادب یا ادب اور علم۔اگر علم نہیں ہے تو ادب کرنا نہیں آئیگا۔

ادب کیلئے کھڑا ہونا ضروری نہیں:

ہمارے معاشرے میں بڑوں کے ادب کے ضمن میں معروف ہے کہ جب وہ آئیں تو ان کے احترام میں کھڑا ہوا جائے، یہ لازمی نہیں ہے۔یہ بھی ہمارے ہاں ایک غلط رواج جگہ پاچکا ہے کہ

بڑے جب آئیں تو کھڑا ہوا جائے۔ جبکہ اسلام کے مطابق اگر کسی بڑے کے لئے کھڑے نہ ہوں تو یہ بے عزتی یا بے ادبی کی علامت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی انسان آنے والے کے لئے خود کھڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ کھڑا ہونا واجب نہیں ہے لیکن کوئی گناہ بھی نہیں ہے کوئی کھڑا ہو جاتا ہے تو ہو جائے، نہیں ہوتا تو بے ادبی میں شمار نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں تو لوگ آپ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے زیادہ کوئی اور ہمیں محبوب نہ تھا لیکن ہم آپ ﷺ کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ آپ ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))(۱)

''اگر کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ میرے آنے پر لوگ کھڑے ہو جائیں اور میں بیٹھوں تو لوگ میرے سرہانے کھڑے رہیں تو وہ جہنم میں داخل ہونے کی تیاری کرلے۔''

یہ ''انا'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ انسان کو اچھا لگے کہ لوگ میرے لئے کھڑے ہو جائیں، مستعد (alert) ہو جائیں لیکن اگر کوئی خود اپنی خوشی سے کسی کے ادب و احترام کی خاطر کھڑا ہونا چاہتا ہے تو کوئی حرج بھی نہیں۔

کسی قوم کے بڑے کا ادب:

حدیثِ رسول ﷺ میں آتا ہے: ''جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو''۔ یعنی عزت اور احترام کرو، کسی ایسے انسان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔ جو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہو۔ اگر کوئی کافر اپنے معاشرے میں باعزت سمجھا جاتا ہے اور وہ مسلمانوں کے پاس انکی محفل میں آتا ہے تو اس کافر کی عزت ہونی چاہیے۔ یہ حدیث ہمیں آداب سکھا رہی ہے۔ ایسے شخص کی بے عزتی نہیں کی جائیگی، نہ اس کا مذاق اُڑایا جائیگا اور نہ اسکی تحقیر کی جائے گی۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل للرجل

آج بے ادبی کا کلچر عام ہے:

آج آپ دیکھیں کہ بے ادبی کرنا دنیا کا رواج (culture) ہی بن گیا ہے۔ ہر ایک کی بے ادبی کی جاتی ہے، ہر ایک پر جملے کسے جاتے ہیں، ہر ایک کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، طنز کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی برائیوں کو اُچھال کر اُن پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ عبث کام ہے اور مغرب کی تقلید ہے، وہاں تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی معزز اور محترم ہستیوں پر مزاحیہ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ گویا نعوذ باللہ ان عظیم پیغمبروں کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

بڑوں کا ادب کیسے ہو:

اسلام ہمیں ادب سکھاتا ہے کہ جب بڑے بات کریں تو بیچ میں بات نہ کاٹی جائے۔ بلکہ بات مکمل ہو جانے کے بعد اظہارِ خیال کیا جائے۔ بعض دفعہ معمّر افراد ٹھہر ٹھہر کر اور دُہرا دُہرا کر بات کرتے ہیں، ان کی بات صبر سے سنی جائے، بات مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مکہ میں ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں ولید بن مغیرہ آیا اور اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات شروع کی کہ "بھتیجے تم نے یہ کیا کیا! مکہ کے گھر گھر میں فساد برپا کر دیا! تم نے ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہا" اور اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے عمر میں چھوٹے تھے، مگر رُتبے میں کتنے بڑے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے کتنے پیارے رسول تھے اور وہ اللہ کا دشمن تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات نہیں کاٹی بلکہ صبر اور خاموشی سے سنتے رہے اور پوری بات سنی۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابو ولید آپ کی بات مکمل ہو گئی؟" اس نے کہا "جی ہاں ہو گئی" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کا جواب دیا۔

تو اسلام ہمیں آداب (manners) سکھاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا چھوٹوں کا تکبر ہے کہ وہ بڑوں پر ہنسنا شروع کر دیں کہ پتہ نہیں کیا بولے چلے جا رہے ہیں؟ بار بار ایک ہی بات دہرائے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی بے ادبی ہے، بڑوں کی بات مکمل ہونے کا انتظار کریں توجہ سے سُنیں۔ اسی طرح بڑوں کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُنہیں دُور سے مخاطب نہ کیا جائے بلکہ قریب جا کر بات کی

جائے اور ادب و شائستگی کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کی جائے۔ یہ زیادہ مناسب طرزِ عمل ہے اور یہ اسلامی تہذیب جو سنتِ نبوی ﷺ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے، اس میں بھی پسندیدہ ہے۔

بڑوں کے قریب جا کر آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کرنے کی ہدایت عام حالات میں ہے، ہنگامی صورتحال (emergency) کے دوران نہیں۔ غیر معمولی حالات میں آواز بڑھائی جاسکتی ہے۔ ایک اور بات جو بڑوں کے ادب میں آتی ہے وہ یہ کہ بڑوں سے بحث نہ کی جائے۔ اگر وہ غلطی پر ہیں اور بات نہیں سمجھ پا رہے تو اُن کے لئے دعا کر کے انسان خاموش ہو جائے، ان سے الجھنا صحیح نہیں ہے، تنقیدی انداز سے گریز کرنا چاہیے۔

شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتے ہوئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اُن کی بات مانی جائے، ادب کے ساتھ اطاعت لازم ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کسی کا ادب کیا جائے اور اس کی بات نہ مانی جائے؟

اسلاف میں علماء اور اساتذہ کی عزت:

ایک واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے میں شرکت فرمائی۔ نماز جنازہ کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی سواری کے لئے ایک خچر لایا گیا۔ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جھٹ آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ یہ دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ ذرا ٹھٹکے اور فرمایا اے میرے آقا کے ابن عم میری سواری کی رکاب تھام کر آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کون تھے! نبی اکرم ﷺ کے چچا کے بیٹے، حضور ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے، اِس لحاظ سے انکا بڑا مقام تھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اطمینان سے بیٹھیے علماءِ دین کی اِسی طرح عزت کرنی چاہیے۔

اسی طرح ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اپنے استاد کی جوتیاں اُٹھایا کرو۔ چنانچہ اِس سے پہلے کہ اُستاد مجلس سے اُٹھ کر جاتے یہ شہزادہ دوڑ کر استاد کی جوتیاں اُٹھا لیتا تھا، اس قدر استاد کی عزت ہوا کرتی تھی۔

ایک دفعہ ہارون رشید آیا اور اس نے دیکھا کہ اُستاد صاحب وضو کر رہے ہیں اور شہزادہ پانی

ڈال رہاہے اور وہ اپنے ہاتھ سے پاؤں مَل رہے ہیں تو خلیفہ ہارون ناراض ہوا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ایک ہاتھ سے تو پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے اُستاد کا پاؤں دھوتا۔

یہ اسلام کا معیارِ ادب ہے آپ خود تصور کریں وہ معاشرہ کتنا خوشگوار ہوگا کہ جہاں اساتذہ کی ایسی عزت ہوتی ہوگی، کیا بلند اور پاکیزہ اخلاق ہونگے۔

ادب اور حکم میں تصادم:

حکم کی بجا آوری اور ادب دونوں بہت ضروری ہیں، لیکن اگر کبھی صورت حال ایسی بن جائے کہ بڑوں کا ادب اور حکم آپس میں متصادم (clash) ہو جائیں اور متضاد ہوں تو آیا ادب کا خیال رکھا جائیگا یا حکم ملحوظ رکھا جائے گا؟ تو قانون یہ ہے۔''اَلْاَ مْرُ فَوْقَ الْاَدَبْ''یعنی حکم کو ادب پر فوقیت دی جائے گی۔ تعظیم کا تقاضا ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے۔ چاہے اُس پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، ایسی صورت میں حکم کی فوقیت ہوگی، حکم مانا جائیگا۔ مثلاً کچھ لوگ کسی بزرگ کا ہاتھ ادب کی وجہ سے چومنا چاہتے ہیں لیکن بزرگ کو پسند نہیں کہ کوئی میرا ہاتھ چومے۔ انہوں نے اس سے منع کر دیا تو پھر نہیں چومنا۔

یا بعض دفعہ لوگ ادب کی وجہ سے کسی کا سامان اُٹھانا چاہتے ہوں یا اُستاد کی عزت میں ان کی جوتیاں سیدھی کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن استاد کو نہیں پسند، وہ نہیں چاہتے کہ کوئی میرا سامان اُٹھائے یا میری جوتیاں سیدھی کرے اور انہوں نے ایسا کرنے سے منع بھی کر دیا تو ادب کا تقاضا ہے کہ حکم مانا جائے اور اس عمل سے باز رہا جائے۔

شاہجہان کے دو بیٹے عالمگیر اور داراشکوہ بادشاہت کے خواہاں تھے۔ ایک دفعہ یہ دونوں باری باری ایک ہی بزرگ کے پاس گئے کہ وہ اُن کے لئے بادشاہت کی دعا کریں۔ پہلے داراشکوہ گئے، بزرگ تخت پر بیٹھے تھے داراشکوہ جا کر تخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انہوں نے داراشکوہ سے کہا میرے پاس آ جاؤ تو داراشکوہ نے جواب دیا کہ میری مجال نہیں کہ میں آپ کے برابر میں تخت پر بیٹھ جاؤں۔ بزرگ کے اصرار کے باوجود نہیں مانے اور نیچے ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد عالمگیر آئے۔ وہ بھی نیچے آ کر بیٹھ

گئے۔ بزرگ نے ان سے بھی یہی فرمایا کہ میرے پاس تخت پر آ جاؤ۔ جب بزرگ کا حکم ہوا تو عالمگیر فوراً اُٹھ کر تخت پر اُن کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کے جانے کے بعد بزرگ نے فرمایا کہ دونوں بھائیوں نے اپنا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ داراشکوہ کو تخت پیش کیا گیا اُس نے انکار کیا، عالمگیر کو پیش کیا گیا اس نے قبول کر لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حکم دیا جائے وہ مان لینا چاہیے چاہے اس سے ادب میں کمی آ رہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ شاگرد یا ماتحت وغیرہ ادب کی وجہ سے یا تعظیم کی وجہ سے کوئی کام کر رہے ہوں اور اُستاد یا عمر میں بڑا یا رُتبے میں بڑا وہ اُس چیز سے گھٹن محسوس کر رہا ہو۔ اُسکو پریشانی (irritation) ہو رہی ہو، بے اطمینانی (uncomfortable) محسوس ہو رہی ہو تو پھر انسان ایسا کرنے سے باز آ جائے۔ کسی نے کہا ہے:

عشق تسلیم و رضا کے ما سوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر اُن کو وفا نہیں چاہیے، وفا سے خوش نہیں تو پھر ایسی وفا سے کیا فائدہ۔ اسی طرح ایسے ادب کا کیا فائدہ جو دوسرے کو پریشانی اور اُلجھن میں مبتلا کر رہا ہو۔

جب بڑوں کا صحیح معنی میں ادب ہوگا تو ساتھ ہی ان کے احکامات کا بھی ادب ہوگا۔ جو بڑے حضرات احکامات دیتے ہیں اُنہیں ہم قانون بھی کہہ سکتے ہیں۔ بڑے حضرات قوانین بناتے ہیں اور ان کے ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے احکامات کو بے چوں و چرا مانا جائے۔

قوانین کا احترام:

اگر ہم حکومت کا ادب کریں گے تو حکومت کے قانون کا بھی ادب کرینگے مثلاً اشارہ (signal) نہیں توڑیں گے اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے کہ قوانین کو جب چاہے پامال کر دیں۔ اسلام نے تو قانون کا ادب کرنے کا تقاضا کیا ہے اور جو قانون کا ادب کریگا وہ اپنے لئے اصولوں میں تبدیلی نہیں چاہے گا کہ میری وجہ سے فلاں قانون تبدیل کر دیا جائے یا یہ کہ یہ قوانین سب کے لئے ہیں مگر میرے لئے نہیں۔ دراصل یہ بھی اَنا کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے کہ کوئی خود کو قانون سے

بالاتر سمجھ بیٹھے، جبکہ دیگر لوگ ان کا احترام کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھے کہ سب قوانین میری آسانی (convenience) کے لیے ہیں۔ اور میری ذات کے اردگرد گھومتے ہیں اور صرف میرے فائدے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ''انا'' متوازن ہے وہ قوانین میں تبدیلی نہیں چاہتے بلکہ اپنے آپ کو مقید (bound) محسوس کرتے ہیں۔ جب قانون کا ادب اور احترام ہو تو قانون کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوگی۔ شریعت کیا ہے؟ اللہ کا دیا ہوا قانون ہے، حدود (bounderies) ہیں۔ اللہ کا ادب ہوگا تو شریعت کا ادب ضرور ہوگا، انسان کے دل میں اس کا لحاظ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ ایک حدیث میں یہ مضمون بیان فرماتے ہیں کہ

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلَى آخِيَّتِهِ يَجُولُ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلَى آخِيَّتِهِ))(۱)

''مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے جو کہ بندھا ہوا ہے جتنی رسی اجازت دیتی ہے اتنا وہ گھوڑا چرچگ لیتا ہے۔ اس رسّی کی لمبائی کے اندر اندر رہ کر گھوم پھر لیتا ہے۔''

مثال کے طور پر ایک گھوڑا ایک میٹر کی رسی سے بندھا ہوا ہے اب گھوڑے کا دل چاہے گا تو آدھے میٹر پر بیٹھ جائے، پون میٹر پر چلا جائے وہیں بیٹھے، چرے، سو جائے، لیکن رہے گا وہ ایک میٹر کے دائرے کے اندر اندر ہی، یہ حدود پامال نہیں کرے گا۔ مومن کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتا ہے قانون توڑ کر پھلانگتا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (البقرۃ:۲۲۹) ''یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں انہیں مت پھلانگنا۔'' انسان خود کو پابند محسوس کرے، مادر پدر آزاد نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک آیت کے مطابق ان کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جب اپنے آپ کو پابند کر لے گا تو قوانین کے بارے میں شکایتیں بھی پیدا نہیں ہونگی۔

قانون کے فوائد:

قانون بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت حاصل ہوتی ہے، اجتماعی کام آسان ہو جاتے ہیں اور سب کے ساتھ برابری کا سلوک (treatment) کیا جاتا ہے، سب سے برابری کا

(۱) بخاری، كِتَابُ الْأَحْكَامِ، بَابُ كَيْفَ يُبَايِعُ الْإِمَامُ النَّاسَ

معاملہ کیا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کا پابند بناتا ہے تو اس میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یعنی قانون کی پابندی سے بہت سی مثبت خوبیاں ابھرتی ہیں۔ اگر قانون فائدہ مند چیز نہ ہوتا تو ازل سے ہی ان کا وجود نہیں ہوتا۔ یہ قوانین انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ اللہ نے بھی شریعت کی شکل میں قوانین دیئے ہیں اور انسان بھی معاملات کو چلانے کے لئے قوانین بناتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ادارے کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ گویا کہ انسانی معاشرے کے لیے ترتیب قانون ایک امرِ ناگزیر ہے۔ اور اس سے بہت سی مثبت صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، عزم (commitment) پیدا ہوتا ہے، اطاعت کا جذبہ ابھرتا ہے، قربانی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، صبر واستقلال پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی اَنا اپنے مقام پر قائم رہتی ہے اور ایسے معاشرے کا ہر فرد ایک منظم فرد بن جاتا ہے۔ مساوات کی فضا پیدا ہوتی ہے اور پھر جو انسان اپنے آپ کو قانون کی اطاعت اور پیروی کا عادی کر لیتا ہے تو مشکلات اور دِقت کے باوجود وقت پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات — جن کا نقطۂ آغاز غزوۂ بدر تھا، یہ عظیم کامیابیاں تنظیم واطاعت کے بدولت حاصل ہوئیں۔

اسی طرح قانون کا ادب کیا ہے؟ قانون کا ادب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ کہا جاتا ہے: (Rules are made to be obeyed not to be broken) ایسے قانون کا کیا فائدہ جسے ہر شخص توڑنے پر کمر بستہ ہو۔ اُس قانون کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی برکت ہی ہے۔ معاشرے کے کچھ لوگ اگر قانون توڑتے ہیں تو باقیوں میں غم وغصہ پیدا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ انتشار (anarchy) کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لئے قانون کو برقرار رکھنے کے لئے اور اس کے ثمرات اور برکات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ 99.99 فیصد لوگ اس پر عمل کریں۔ خود کو پرسکون رکھنے کے لئے بھی قانون کا ادب نہایت ضروری ہے ورنہ انسان جھنجلاہٹ میں مبتلا رہتا ہے۔ ماحول میں امن وسکون کے بجائے تنازعہ (conflict) کی فضا رہتی ہے۔ اگر قانون کا ادب اور اطاعت نہ کی جائے تو ہر وقت ٹکراؤ، بدگمانی اور غصے کی کیفیت رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں امور کی انفرادی اور اجتماعی کیفیت شدید متاثر ہوگی۔

اسلام میں پابندی، اطاعت اور نظم ونسق:

اسلام کے جملہ انفرادی واجتماعی احکام میں ہمیں ایک نظم وضبط کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نماز میں صفوں کی درستگی بھی لوگوں کے اندر نظم پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ میدانِ جنگ ہو یا باجماعت نماز ہو مسلمانوں کو صفیں درست کرنے کی عادت ڈالی گئی۔ جب نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہوا تو لوگ صفیں بنا بنا کر حجرے میں جاتے نماز جنازہ پڑھتے اور باہر نکل آتے تھے۔ تمام لوگ منظم اور پُرسکون رہے۔ کوئی ہڑبونگ نہیں مچی، نہ دھکم پیل ہی ہوئی کہ لوگ پیروں تلے روندے جارہے ہوں۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان کو ایسے اطاعت کی، قانون کی پابندی کی (discipline) کی عادت پڑ گئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ جو لوگوں سے بیعت لیا کرتے تھے اس کے الفاظ بھی نظم وضبط کی اعلیٰ مثال ہیں۔

((بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَهِ وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ وَأَنْ نَقُومَ أَوْ نَقُولَ بِالْحَقِّ حَیْثُمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))(۱)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے کہ ''ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے (مسلمانوں کو قانون پر تنقید کی عادت نہیں تھی، قانون کو ماننے کی عادت تھی) خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو، خواہ ہماری طبیعت کو خوشگوار لگے خواہ ناگوار لگے، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے، اور جس کو بھی ہم پر امیر بنایا جائیگا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور اللہ کے معاملے میں حق کہنے سے ہم ہرگز نہیں ڈریں گے، نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں لائیں گے۔'' یہاں غور کریں کہ ہر نقطے پر کتنا زور ہے، چاہے دل چاہے یا نہ چاہے۔ چاہے خوش اور راضی ہوں چاہے ناخوش اور ناراض ہوں، مشکل ہو یا آسانی ہو، ہم اطاعت کریں گے۔

تو اسلام مسلمانوں کا اعتراض والا (challenging) مزاج نہیں بناتا، ہر چیز کو رد کرنے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان

مت کھڑے ہو جاؤ۔ ہر قانون کی اصلاح (correction) کی ذمہ داری اپنے سر مت لو۔ جب انسان قانون کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے تو وہ اطاعت نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ قانون درست ہی نہیں ہے اس کی اطاعت کیا کریں۔ تو قانون پر تنقید کرنا بھی بے ادبی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ النور آیت نمبر ۶۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ﴾

”بے شک مومن وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جب وہ ان کے ساتھ کسی اجتماعی معاملے میں ہوں جب تک اجازت نہ ملے، نہیں جاتے۔“

اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی ہے تو آپ ﷺ سے اجازت مانگتے ہیں اس کے بغیر نہیں جاتے۔

سورۃ النساء آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور اطاعت کرو اُن لوگوں کی کہ جو تمہارے معاملے کا اختیار رکھتے ہیں۔“

جن کے پاس کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی مرتبہ ہے اور انہوں نے کوئی قانون بنایا ہے تو اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ دراصل اطاعت کرنا انا کو بہت ناگوار گزرتا ہے۔ جس کی انا حد سے بڑھی ہوئی ہے اس پر اطاعت سے بھاری اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب انسان اپنی انا کو قابو کرتا ہے تو وہ باادب ہو جاتا ہے، اطاعت گزار ہو جاتا ہے، ادب کرنے کی اُس کو عادت ہو جاتی ہے، قوانین کا ادب کرتا ہے۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی جذباتی یا غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو ادب کی عادت انسان کے کام آتی ہے۔

عادتوں کو فطرت کے قریب کیا جائے:

فطرت اور جبلّت میں سے ادب کا تعلق فطرت سے ہے۔ ہم سمجھ چکے ہیں کہ جانوروں کے اندر فطرت نہیں ہوتی بلکہ صرف جبلّت ہوتی ہے جبکہ انسانوں میں فطرت بھی ہوتی ہے۔ اور اسی فطرت اور جبلت کے امتزاج (combination) سے عادتیں وجود میں آتی ہیں۔ تو کیوں نہ ہم اپنی عادتوں کو فطرت کے قریب لے جائیں۔ یہ چیز انسان کو بہت فائدہ دیتی ہے اور کڑے وقت میں انسان کو سنبھال لیتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا مظاہرہ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کو اطاعت کرنے کی عادت تھی لہذا اس عادت نے مسلمانوں کو اس آزمائش کے موقع پر فساد سے بچالیا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے مسلمان بالکل خوش نہیں تھے، لیکن نظم وضبط (discipline) کی عادت تھی اسی لیے اس کٹھن وقت میں بھی اطاعت کر گئے۔ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورہ الفتح آیت نمبر ۲۶ فرمایا ہے:

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾

”اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، انہوں نے اپنے دلوں میں جاہلی حمیت بٹھالی، وہ جوش اور جذبات میں بے قابو ہو گئے تو اللہ نے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول ﷺ پر اور مومنوں پر اور اللہ نے چپکا دیا اُن کے ساتھ تقویٰ کی بات کو۔“

اس بھلی عادت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تقویٰ اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے، درحقیقت تقویٰ بغیر ادب کے نہیں آسکتا۔

”ادب“ اور ”احترام“:

لفظ ”ادب“ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ظاہری اعتبار سے اور معنوی اعتبار سے۔ یعنی ادب کا ایک تعلق جسمانی حرکات سے ہے اور دوسرا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ ان دونوں کیلئے ہم دو مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ادب اور احترام۔ ”ادب“ کا تعلق ظاہری رویّہ (etiquette)

سے ہے اور احترام کا تعلق قلب سے ہے۔

ابھی تک ہم نے ادب کے موضوع پر بات کی ہے اب احترام پر ذرا روشنی ڈالتے ہیں۔ لفظ ''احترام'' بنا ہے حرمت سے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی عظمت کی وجہ سے اس کی تعظیم کرنا۔ اگر دل کے اندر عزت واحترام (respect) ہے تو خود بخود احترام چھلکے گا۔ اصل ادب تو یہ ہے کہ دل میں بھی احترام ہو اور جسم کی حرکات وسکنات سے بھی اس کا اظہار ہو، نہ کہ دکھاوا یا بناوٹی عزت واحترام۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان ہر ایک کا دل سے احترام نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں کا ادب کرنے کا تقاضا ہوتا ہے بعض دفعہ دل میں ان کا احترام نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے، ایسے وقت میں انسان کیا کرے؟ ایسے وقت میں انسان کو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور دل میں کسی شخص کے لئے احترام نہیں ہے تو کم ازکم رویّے سے اس کا اظہار نہ ہو، اس سے کم ازکم معاشرے میں امن رہتا ہے۔

مثال کے طور پر کوئی مہمان آتے ہیں۔ مہمانوں کا ادب اور حق یہ ہے کہ خوش دلی سے اُن کا استقبال (welcome) کیا جائے، خوش آمدید کہا جائے۔ لیکن اگر کچھ ایسے لوگ آجائیں جن کا دل میں احترام نہیں ہے، جنہیں دیکھ کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی لیکن ایک عادت ہے کہ ملنے والوں سے مسکرا کر ملنا ہے، یہ فطرت (nature) بن گئی ہے تو ہم اُن سے عادتاً مسکرا کر بات کریں گے، اُن سے اچھی طرح سے پیش آئیں گے۔ اپنی حرکات اور سکنات سے ظاہر نہیں کرینگے کہ ان کا آنا پسند نہیں آیا۔ بچپن سے ہمیں جو آداب سکھائے جاتے ہیں وہ ہمارے بہت کام ہیں۔ پھر ہم دوسروں کو اُن کا مقام تو کم ازکم دے ہی دیتے ہیں، بے عزتی نہیں کرتے۔ جو کچھ سکھایا گیا ہے، جس کی تربیت ہو چکی ہے وہی رویّہ غیر شعوری طور پر سرزد (reflex action) ہوتا ہے۔

بچوں کو عادت ڈالنی چاہیے کہ بڑوں کے سامنے زبان درازی نہ کریں اور نہ ان کو پلٹ کر جواب دیں، جب یہ عادت گھٹی میں ڈال دی جاتی ہے تو پھر زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہنا آسان ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھار لڑکیوں کو ایسے سسرالیوں سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں کچھ لوگ اچھے نہیں لگتے تو انسان اپنا رویّہ مناسب رکھ کر بہت ساری تلخیوں سے بچ جاتا ہے، بے ادبی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ جو

لوگ بڑوں کو منہ در منہ جواب نہیں دیتے انھیں بعد میں پشیمان نہیں ہونا پڑتا۔ اور پچھلے دور میں یہ بہت بڑی خاصیت سمجھی جاتی تھی، اب یہ معیار بدل دیا گیا ہے اور بے ادبی کو اعتماد کہہ دیا گیا ہے۔ بدتمیزی کو خوداعتمادی (confidence) کہہ دیا گیا ہے تو معاملات بھی تلپٹ ہو گئے۔ جب کوئی بدتمیز اور بے ادب ہو اور اس کی اسی وجہ سے عزت ہونے لگ جائے، ان کمزوریوں یا برائیوں کو اچھے اچھے نام دے دیئے جائیں تو پھر لوگ کسی کا بھی ادب نہیں کرنا چاہیں گے لہٰذا ادب کرنا ضروری ہے۔

ادب کرنا بے چارگی، کمزوری یا بزدلی کی علامت نہیں ہے۔ ادب وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر بھرپور طاقت ہوتی ہے اور جو اندر سے بااعتماد ہوتے ہیں ورنہ زبان تو سب کے پاس ہے۔ اور اس کو چلانا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن انسانیت یہ ہے کہ انسان زبان اپنے قابو میں رکھے۔ ورنہ اگر اس کو قابو میں نہ کیا تو ہم جانور کی سطح پر گر جائیں گے، کیونکہ جانور ایک دوسرے پر غراتے ہیں، ادب نہیں کرتے۔ یہ بدتمیزی اور بے ادبی تو جانوروں کی عادت ہے کہ گوشت کے ٹکڑے کی خاطر ایک دوسرے پر غراتے ہیں، حملہ کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ زبان درازی کی عادت انسانی معاشرے میں نہیں ہونی چاہیے۔

استاد کے آگے زبان درازی کرنا، شکلیں بنانا، پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑانا یا صدرِ مملکت کا مذاق اڑانا یا ماں باپ کو ترکی بہ ترکی جواب دینا اچھی عادتیں نہیں، اچھا اخلاق نہیں۔ اس سے اصلاح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہم تمام مسلمانوں کو مؤدِب بنادے۔

انا

تزکیے کے تعارف اور ادب کے بعد چند عنوانات سے گفتگو کا آغاز کریں گے، اس ضمن میں پہلا عنوان ''انا'' ہے۔

تزکیے کا عمل ایک مالی کے کام سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مالی کیا کرتا ہے؟ کچھ پودے لگاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان پودوں کو غذا ملے اور یہ صحت مند ہوں، خوبصورت ہوں، پھلیں پھولیں۔ اس کے علاوہ جو بھی جھاڑ جھنکار (weeds) چاروں طرف اُگتی ہے اس غیر ضروری اور نقصان دہ جھاڑیوں کو مالی صاف کرتا رہتا ہے، اکھاڑتا رہتا ہے تاکہ یہ جھاڑ جھنکار مٹی کی قوتِ نمو، سورج کی روشنی اور پانی و ہوا میں حصہ دار نہ بن جائے لہٰذا وہ صفائی اور چھٹائی کرتا رہتا ہے (cultivation through pruning) تاکہ پودے اچھے اور صحت مند رہیں اور پروان چڑھیں، تزکیہ بھی دراصل یہی ہے۔ کسی چیز کو نشو نما دینا اور غلط چیزوں کو اُس کے پاس سے دُور کرتے رہنا۔ مومن کا کام بھی مالی کے کام جیسا ہی ہوتا ہے۔ مومن چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں مجھ میں رکھی ہیں اور جو وقت مجھے عطا کیا ہے وہ وقت اور صلاحیتیں نیکیوں کو پروان چڑھانے میں کام آئیں اور یہ وقت اور صلاحیتیں گناہوں کے کاموں میں استعمال نہ ہوں، گناہ اس کے وقت اور صلاحیتوں میں حصہ دار نہ بنیں۔ کسی بزرگ نے بہت ہی پیاری بات کہی ہے: ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس باغ کے اندر نیکیوں کے رنگ برنگے پھول کھلیں، نیکیوں کی بہار آئے، انسان نیک اعمال کی خوشبو سے معطر ہو اور گناہوں کی خزاں سے، گندے کاموں کی نجاست سے دور رہے۔ اور برے کاموں کی بُو سے پاک صاف رہے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنا اور نیکیوں سے آراستہ کرنا دو طرفہ عمل ہے اور اسی کا نام تزکیہ ہے۔ اپنی ذات کا تزکیہ کرنا ہے تو اس کیلئے خود شناسی (self recognition) یعنی اپنی پہچان بہت ضروری ہے۔

انا عربی زبان کا لفظ ہے، اسکا مطلب ہے، ''مَیں''۔ اس کائنات میں موجود تمام مخلوقات

کے اندر ''میں'' کا احساس نہیں سوائے انسانوں اور جنّات کے لیکن ہم اپنی گفتگو کا دائرہ صرف انسان تک محدود رکھیں گے۔ انسانوں میں خودشعوری (self conscious) کا احساس موجود ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں وہ شعور (conscious) تو رکھتے ہیں، انکے اندر حس بھی ہے مگر خودشعوری نہیں ہے۔ خودشعوری صرف اور صرف انسانوں یا جنوں میں ہے۔ اللہ نے انسان میں انا رکھی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود کو پہچانے، اللہ کی مخلوقات میں اپنا مقام پہچانے، وہ یہ مشاہدہ کرے کہ اس پوری کائنات میں میرا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ (where do I stand?) اس عالم شہادت کی تمام مخلوقات میں ''مَیں'' کہاں کھڑا ہوں؟ اپنے مقام اور مرتبے کو پہچانے گا، تب ہی ان سے درست اور متوازن تعلق قائم کر سکے گا، اور وہ یہ جان سکے گا کہ کس کا مجھ پر کتنا حق ہے، اور میرا دوسروں پر کیا حق ہے اور اسی طرح اپنی ذمہ داری (responsibility) کا بھی احساس ہوگا۔

اللہ کی کتاب میں بہت سی مخلوقات کا ذکر ہے۔ مثلاً پودوں اور پیڑوں کا، پہاڑوں کا، زمین و آسمان کا، سمندری مخلوقات کا، حشرات الارض کا، فرشتوں اور جنّات وغیرہ۔ غور کریں تو انسان کسی نہ کسی اعتبار سے ان سب کے ساتھ متعلق ہے۔ اسی طرح عناصرِ فطرت اور عاقل مخلوقات یعنی فرشتوں اور جنوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق رہتا ہے۔ لیکن انسان کے سوا کسی مرئی مخلوق میں ''انا'' نہیں ہے، اپنے کچھ ہونے کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے بارے میں نہیں سوچتے کہ میں کون ہوں اور کیسا لگ رہا ہوں؟ جبکہ انسان یہ سب کچھ سوچتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں حسّاس (sensitive) ہے، اُسے اپنی ذات کا شعور ہے۔ اسی طرح اپنی ہستی کا، اپنے ''میں'' ہونے کا احساس ہے۔ انسان کو اپنے ایک شخص (person) ہونے کا احساس ہے۔ وہ خود کو جانچ (judge) سکتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کر سکتا ہے کہ میں یہ کام کرتے ہوئے اچھا لگ رہا ہوں یا نہیں۔ میں فلاں سوٹ پہن کے اچھا دِکھ رہا ہوں یا نہیں۔ خودشعوری کی ایک جھلک آئینہ دیکھنے سے نظر آتی ہے، مخلوقات میں صرف انسان ہی شیشہ دیکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اُسے کہیں شیشہ نظر آجائے تو فوراً خود کو سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالتا ہے۔ جبکہ کوئی جانور یا کوئی دیگر مخلوق آئینہ دیکھ کر خود کو درست کرنے کی فکر نہیں کرتی۔ یہ تو صرف انسان کا خاصہ ہے کہ وہ

سوچتا ہے کہ وہ کیسا لگ رہا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اچھا لگے اور یہ اسی ''انا'' کا نتیجہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انا ضروری چیز ہے اس کو فنا نہیں کرنا۔ اسلام ہماری انا مٹانے نہیں آیا بلکہ انا کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے آیا ہے۔ اور شریعت اس معاملے میں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہے۔ انا کو کچل دینا، ختم کر دینا مقصد نہیں ہے۔ نہ اس کو بالکل مٹانا ہے اور نہ حد سے بڑھانا ہے بلکہ مناسب اور معتدل رکھنا ہے۔ اس خود شعوری کی بنا پر انسان اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے کیا چیز فائدہ دی گی اور کیا نقصان، کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ اور اس قوتِ فیصلہ کی بنا پر ہی اللہ کے ہاں اس کا محاسبہ ہوگا۔

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکھف: ۲۹)

''جو چاہے ایمان لے آئے جو چاہے کفر کرے۔''

ایمان لانے پر جزا ہے جبکہ ایمان نہ لانے پر سزا ہے۔ اس لئے کہ ایمان لانا یا نہ لانا اس کے فیصلے پر منحصر ہے، اس کی اپنی پسند (choice) ہے۔ جانوروں کیلئے کوئی جزا و سزا نہیں ہے اس لئے کہ جانور تو صرف جبلّت پر عمل کرتے ہیں۔ وہ شعور کے ساتھ فیصلے نہیں کرتے وہ تو بس سُدھائے (programmed) ہوئے ہوتے ہیں۔

انسانی امتحان کے لئے شعورِ ذات واختیار:

انسان چونکہ شعور سے فیصلے کرتا ہے اور یہی شعور واختیار اس کے امتحان کی وجہ ہے۔ دنیا میں انسان کا امتحان ہو رہا ہے۔ سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك: ۲)

''اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تا کہ وہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے عمل کرتا ہے۔''

دنیا میں انسان امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے سو اس میں انا کا ہونا بھی ضروری ہے تا کہ اس میں فیصلے کی قوت، ارادہ کی طاقت، اچھے برے کی پہچان اور پسند و ناپسند کے معیارات ہوں ورنہ امتحان نہیں ہو پاتا اور انسان بھی ہواؤں، پہاڑوں اور دریاؤں کی طرح کی مخلوق بن کر رہ جاتا، جانوروں کی طرح

ایک بے اختیار مخلوق بن کر رہ جاتا۔ اسی لئے انسانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو اپنے "مَیں" ہونے کا احساس نہیں، جس کو اپنے شخص (person) ہونے کا احساس نہیں، جس میں انا نہیں۔ کیونکہ اگر انا نہیں تو اللہ کے ہاں اس کا محاسبہ (accountability) بھی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص پاگل ہو جائے تو اس کی کوئی شخصیت (personality) نہیں رہتی۔ پاگلوں میں انا نہیں ہوتی، ان میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی شعور نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ کے ہاں پاگلوں کا کوئی محاسبہ، کوئی حساب کتاب، کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے۔

اللہ کی "انا" اور انسان کی "انا":

جہاں تک اس لفظ "انا" کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ اپنے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔ سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا:

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِیۡ﴾

"بیشک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کیلئے نماز پڑھا کرو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ یہ لفظ اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ میں نہ صرف "انا" ہے بلکہ "انائے کبیر" (infinite Ego) ہے۔ علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کو (The big I am) کہا ہے۔ اس کے برعکس انسان کی انا "انائے صغیر" (finite ego) ہے۔ نماز میں انسان اپنی انائے صغیر کو اللہ کی انائے کبیر کے آگے جھکاتا ہے تو انسان کی انا درست حالت پر قائم ہو جاتی ہے، پہلے وہ کہتا ہے اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے، پھر سبحان ربی العظیم "میرا رب پاک ہے، وہ سب سے عظیم ہے"۔ سبحان ربی الاعلیٰ "میرا رب پاک ہے جو سب سے اعلیٰ ہے"۔ چنانچہ نماز میں اس بات کا اقرار موجود ہے کہ میں اکبر نہیں تُو اکبر ہے، میں عظیم نہیں تُو عظیم ہے، میں اعلیٰ نہیں اے اللہ! تُو اعلیٰ ہے، نماز کے ذریعے انا اللہ سے جڑی (connected) رہتی ہے اور یہ ایک صحت مند "انا" کی نشانی ہے، جو اللہ کے آگے جھکی رہے اور اُسی سے جڑی رہے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (١٤) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (١٥)﴾ (الاعلیٰ)

''فلاح پائی اس نے جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اس نے اللہ کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔''

انسان کے لئے اپنے مقام ومرتبے کی پہچان:

تزکیہ اسی کا ہوسکتا ہے جو نماز پڑھے اور اپنے رب کو یادرکھے۔ جب اللہ سے تعلق درست ہوتا ہے تو انسان باقی مخلوقات میں اپنا مقام ومرتبہ کو پہچان لیتا ہے۔ ورنہ انسان کو کون بتائے گا کہ باقی مخلوقات میں تمہارا کیا مقام ہے؟ تم باقی مخلوق کی طرح نرے حیوان ہو یا تم جانوروں سے بھی کوئی نچلے درجے کی ہستی ہو یا تم ان سب سے اعلیٰ اور افضل ہو۔ یہ تو وہی بتائے گا جس نے انسان کو پیدا کیا۔ قرآن میں آتا ہے: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الملک:١٤) ''کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟'' تو انسان ہونے کے ناطے میرا کیا مقام ہے؟ یہ اللہ کے سوا مجھے کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں انسان کا مقام واضح فرما دیا۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ٣٠ میں فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيفَةً﴾ ''بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' معلوم یہ ہوا کہ دنیا کی ساری مخلوقات پر انسان اللہ کی طرف سے حکمران بنا کر بھیجا گیا ہے۔ انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے، بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلافت کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ مخلوقات کی دیکھ بھال کی جائے، ان کی بہتری (wellbeing) کا خیال رکھا جائے جس کے بدلے میں تمام مخلوقات انسان کی خدمت (serve) کریں گی، اور انسان اُن سے کام لیگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (الجاثیہ: ١٣)

''اللہ نے مسخر کردیا ہے تمہارے لئے جو کچھ کہ زمین میں ہے سب کا سب۔''

یعنی یہ سب انسان کے خادم ہیں، اسکی چاکری میں لگے ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، پیڑ پودے، جانور، دریا اور سمندر یہ سب انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، انسان ان پر حاکم ہے، یہ سب مسخر ہیں۔ وہ اللہ کے حکم سے ان سب پر حاوی ہے۔ اللہ کا نمائندہ بن کر آیا ہے۔ ان سب باتوں سے انسان کے اندر شرف کی اور عزت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جب اس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ میں ان تمام

مخلوقات سے اعلیٰ واشرف ہوں تو وہ کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکتا، ان کے آگے ماتھا نہیں رگڑتا اور نہ اپنی انا کو کمتر مخلوق کے آگے ہی جھکاتا ہے۔ یہ تو ہوا عالمِ شہادت کی مخلوق کا حال۔ اب عالمِ غیب میں جو مخلوق ہے یعنی فرشتے، انکے ساتھ انسان کا رشتہ کیسا ہونا چاہیئے؟ ان کا کیا رتبہ اور کیا مقام ہے۔ کیا انسان فرشتوں سے اعلیٰ ہے یا فرشتوں جیسا ہے یا ان سے کمتر ہے۔ اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں بتایا ہے۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۳۴ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ﴾ (البقرة: ٣٤)

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو آدم کو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔''

قرآن میں بعض مقامات پر آتا ہے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ (الحجر: ۳۰) ''سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا''۔ انسان کے آگے سب جھک گئے تو پتہ چلا کہ وہ تو مسجودِ ملائک ہے، اُسے تو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات (master piece) ہے سب مخلوقات میں اشرف، اعلیٰ، افضل، ارفع اور بہترین ہے۔ نوری مخلوق سے بھی بہتر، ناری مخلوق سے بھی بہتر اور تمام خاکی مخلوق سے بھی بہتر ہے اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے، آپ کو، ہم انسانوں کو کتنے پیار سے بنایا ہے۔ ہر انسان اللہ کی خلاّقی کا نمونہ ہے۔ بھیڑ بکریوں (mass production) کی طرح نہیں کہ سب انسان ایک جیسے ہو گئے، ایک ہی سانچہ (mould) بنا کر سب کو اس میں ڈھال دیا۔ ہر انسان دوسرے انسان سے جدا ہے۔ جڑواں بچے (twins) بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی بھی اپنی ایک الگ شناخت، الگ پہچان، الگ انا، الگ شخصیت ہوتی ہے۔ ہر انسان کی انگلیوں کے پور تک مختلف ہیں ہر انسان نایاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خاص مقام عطا فرمایا ہے۔ انسان اپنے رب کے نزدیک بہت منفرد (special) ہے جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے، خوشی کا احساس ہوتا ہے، اپنی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، شکر کے جذبات اُمڈ آتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۰ میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں فوقیت بخشی۔''

انسان جب اس طرح سوچتا ہے کہ میں اتنا اعلیٰ ہوں، اتنا ارفع ہوں تو وہ اپنے رب سے جُڑا رہتا ہے، اپنے صحیح مقام کو پہچان لیتا ہے۔ اس کی انا صحت مند رہتی ہے اور وہ پُر اعتماد رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی صورتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ﴾(التغابن:۰۳)

''ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں اور کیا ہی اچھی بنائی ہیں تمہاری صورتیں۔''

جس رب نے مجھے بنایا ہے اس کی نظر میں میں بہت خوبصورت ہوں، میں بہت اچھا ہوں یہ احساس انسان کے اندر خوشی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھے، بنانے والے کی نظر سے جانچے۔ پیدا بھی اُسی نے کیا ہے، لوٹ کر بھی اُسی کی پاس جانا ہے، وہی مالک ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے۔ جس کی میں مِلکیت ہوں، جس نے مجھے بنایا ہے، جب اس کی نظر مِیں مَیں اتنا اچھا ہوں یا اتنی اچھی ہوں تو مجھے کسی اور کی کیا فکر؟ اردو میں ایک کہاوت ہے کہ ''دلہن وہی جو پیا من بھائے'' سہاگن وہی ہے جو شوہر کو اچھی لگے وہ عورت کسی اور کو اچھی نہیں لگتی تو نہ لگے۔ اگر میاں کو اچھی لگتی ہے تو بس کافی ہے۔ کچھ خواتین کے اوپر کوئی خاص رنگ یا ڈیزائن بالکل نہیں جچتا، لوگ کہتے ہیں تم پر یہ رنگ جچ (suit) نہیں رہا، تم پر یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن وہ پھر بھی پہنتی ہیں کہ میرے میاں کو یہ رنگ مجھ پر اچھا لگتا ہے۔ تو جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے پھر وہ لوگوں کی رائے (opinion) سے، اُن کی پسند اور ناپسند سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ اس بات پر مطمئن رہتا ہے کہ میں اللہ کو تو اچھا لگتا ہوں۔ مجھے تو وہی کام کرنے ہیں جو میرے رب کو پسند ہیں۔ تو جب تک انسان اللہ سے جڑا رہتا ہے اپنی نظروں میں خود بہت اعلیٰ وارفع

رہتا ہے اور جب انسان اللہ سے اپنا تعلق کاٹ لیتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ کو کمتر مخلوقات کا غلام بنالیتا ہے۔اُن کی آراء،ان کی پسند ناپسند سے متاثر ہونے لگتا ہے۔پھر انا اپنے مقام سے گر جاتی ہے،احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتی ہے۔اس لئے کہ وہ اب خود کو اللہ کی نظر سے نہیں دیکھ رہے۔خدا شعوری (God conscious) کے بجائے لوگوں کی پرواہ (people conscious) کرنے لگے ہیں،اور لوگوں کی بہت پرواہ کرنا،اپنے آپ کو لوگوں کی نظر سے دیکھنا کہ لوگ کیا کہیں گے،کیا سوچ رہے ہونگے انسان کو پریشان (nervous) کر دیتا ہے۔اعتماد ختم ہونے لگتا ہے،احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتی ہے۔اور یہ تمام چیزیں انا کو اس کے مقام سے گرا دیتی ہیں اور جب تک انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے متقی رہتا ہے،انا معتدل رہتی ہے۔یہ احساس رہتا ہے کہ میں مخلوقات میں سب سے برتر اور اعلیٰ ہوں۔ان کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے تو ان باتوں سے،ان احساسات سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے،انسان اپنی نظروں میں باعزت رہتا ہے۔اور یہی خود اعتمادی اور اپنی نظروں میں باعزت ہونا مومن میں مطلوب اور پسندیدہ صفت ہے۔

عزت و بقائے نفس:

بندۂ مومن کو چاہئے کہ اپنے آپ کو پسند کرے،خود کو برا بھلا نہ کہے۔بعض مذاہب میں 'انا' سے نمٹنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ انا کو کچل کر رکھ دو اور جب انھوں نے اس طرح اپنی انا کو کچلنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔جب انا کو دبایا تو پھر ساری کی ساری توجہ انا پر مرکوز ہو کر رہ گئی،انا کے گرد ہی پوری زندگی ضائع ہو گئی۔اس انا کو ذلیل کیا،اپنے آپ کو جھکایا،اپنے آپ کو تنگ کیا،اس انا کو کچلنے کیلئے ظلم کیا تو ساری کوششیں اکارت گئیں کیوں کہ یہ غیر فطری رویہ ہے۔اللہ نے فطرت میں انا رکھ دی ہے یہ کچلی نہیں جا سکتی۔اگر اس کو دبائیں گے تو دس مزید خرابیاں جنم لیں گی۔خود شکستگی (self defeating) مقصد بن جائے گی اور انا پر اور توجہ دو چند ہو جائے گی۔کچھ لوگوں کی ساری زندگی اسی مہم میں گزر جاتی ہے،اپنے نفس کے ساتھ ہی گتھم گتھا رہتے ہیں مگر کوئی مثبت (positive) نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔بلکہ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس اُن کو پچھاڑ دیتا ہے۔

اگر اللہ کا منشا یہ ہوتا کہ انسان اپنی ذات سے نفرت کرے یا انسان اپنے آپ کو گھٹیا، بے کار، بے عزت اور کمتر سمجھے تو اللہ تعالیٰ استغفار کا دروازہ کھلا نہ رکھتا۔ بلکہ یہ حکم ہوتا کہ گناہ ہو گیا ہے تو ساری زندگی احساسِ جرم (guilt) میں مبتلا رہو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ ہم احساسِ جرم میں مبتلا رہیں۔ اگر ہم ہر وقت احساسِ شرمندگی، احساسِ ندامت میں رہیں گے، اور یہ بوجھ (extra baggage) ساری زندگی اُٹھا کے رکھیں گے تو ہم نیکیوں کی دوڑ میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ہم اس احساسِ جُرم (guilt) کو چھوڑ دیں، معافی مانگ کر گناہوں کو بھول جائیں۔ اللہ معاف کر دیتا ہے، گناہ مٹا دیتا ہے، اُس نے معافی کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ تا کہ یہ نجاست پیچھے چھوڑ کر ہم اپنی راہ لیں۔ چنانچہ دوسروں کے سامنے اپنے گناہوں کا تذکرہ کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ اسلام میں بلاوجہ اعترافِ گناہ (confession) نام کی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان کی عزتِ نفس پر زد پڑتی ہے۔ کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے، اپنے گناہوں کی تشہیر نہ کرے، خود کو دوسروں کی نظروں میں گرانے کی کوشش نہ کرے، بلاوجہ اپنی بے عزتی نہ کروائے۔ خود کو ناپسند کرنا، اپنی ذات سے کراہیت و گھن محسوس کرنا، اپنے آپ سے نفرت (self loathing) میں مبتلا رہنا انسان میں بے اعتمادی پیدا کر دیتا ہے، انسان کی شخصیت مسخ (distort) ہو جاتی ہے۔

جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے، احادیث مبارکہ کے مطابق اللہ مجھ سے ستّر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے تو انسان کو اپنے اوپر بڑا ہی ناز ہوتا ہے، خود کو اہم سمجھتا ہے۔ فطری طور پر انسان چاہتا ہے کہ اللہ مجھ کو پسند کرے یہ چیز اس کے اندر ودیعت شدہ (ingrained) ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو، مجھے پسند کرے اور یہ بھی انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ بھی مجھے پسند کریں۔ یہ کوئی نہیں چاہتا کہ میں معاشرے میں بُرا سمجھا جاؤں، بے عزت ہوں، رسوا اور ذلیل ہوں، لوگ مجھ پر ہنسیں اور مذاق اڑائیں۔ لیکن جب انسان وحی سے کٹ جاتا ہے تو اس طرح کی عجیب عجیب بیماریوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔

یہ جو فطرت میں خواہش ہے کہ اللہ مجھے پسند کرے اور لوگ بھی مجھے پسند کریں، اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان گناہوں سے بچے اور لوگوں کے سامنے اچھے حلیے میں رہے۔ اپنی خَلق کو بھی اچھا رکھے اور اپنی خُلق کو بھی اچھا رکھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں اپنا ظاہری حال حلیہ بگاڑنے سے منع فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے ایک جوتا پہنا ہے اور دوسرا نہیں پہنا، آدھے سر پر بال ہیں اور آدھے سر پر نہیں، پھٹے حالوں گھومنا یا بیماروں کی طرح چلنا اِن تمام امور سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ نبی اکرم ﷺ صاف ستھرے کپڑے پہنا کرتے تھے اور بالوں میں کنگھی کر کے رکھتے تھے۔ اسی لئے اسلام میں پاکیزگی اور صفائی پر اتنا زور ہے ((اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ))[1] "پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے"۔

جن مذاہب میں انا کو کچلنے پر زور دیا گیا ہے، ان کے اندر گندا رہنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے ہاں معیار یہ ہے کہ جو جتنا گندا رہے، بال لمبے، الجھے ہوئے، ناخن بڑے اور غلیظ، دانت کالے اور سانس بدبودار اور لباس بھی میلا اور بدبودار رہتا ہے اتنا ہی وہ متّقی سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کی نظروں میں جتنا حقیر اور ذلیل ہو، اللہ کی نظر میں اتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہے یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس کے بال بکھرے ہوئے اور پراگندہ تھے تو نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: کیا اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں، جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک کرے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے اچھے (presentable) لگیں، صاف ستھرے رہیں۔ خود کو عیب دار نہ بنائیں اور نہ اپنے عیب اور گناہ لوگوں پر کھولیں۔ اسی طرح ایک مومن یہ تمنا نہ کرے کہ لوگ میری بے عزتی کریں، اسکی یہ خواہش نہ ہو کہ کوئی میرا مذاق اُڑائے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے:

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ﴾ (الشعراء: ۸٤)

"اے اللہ بعد میں آنے والوں میں میرا ذکرِ خیر باقی رکھ۔"

انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ لوگ اُسے اچھے نام سے یاد کریں۔ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا بھی حصہ ہے:

---

(۱) مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ماعمل...

((وَاجۡعَلۡنِیۡ فِیۡ عَیۡنِیۡ صَغِیۡرًا وَّفِیۡ اَعۡیُنِ النَّاسِ کَبِیۡرًا)) [1]

''اے اللہ! مجھے اپنی نظر میں چھوٹا دکھا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا کر کے دکھا دے۔''

جب انا صحت مند ہوگی تو انسان کا رویّہ اپنے خالق اور مخلوق کے ساتھ بالکل درست رہے گا۔ انا اللہ کے آگے جھکی رہے اور اس سے جڑی رہے، تو انسان اللہ کی نظر میں بلند رہتا ہے۔ اسے پورا شعور ہوتا ہے کہ میں اس وقت تک باعزّت ہوں جب تک اللہ کی نظر میں باعزّت ہوں، میرے لئے اللہ کا بندہ ہونا باعثِ عزّت ہے۔ عبداللہ سے بڑھ کر کوئی مرتبہ (badge of honour) نہیں ہوسکتا۔ ایسے شخص کو بس ایک ڈر یا خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں اللہ کی نظر سے نہ گر جاؤں۔ یہ احساس تقویٰ کو جنم دیتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے تقویٰ پر بہت زور دیا ہے۔

تقویٰ اور اس کا اثر:

انا کا درست مقام پر ہونا اور اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آجائے کہ اللہ اور انسان دونوں کی نظر میں بیک وقت باعزّت رہنا ممکن نہ رہے تو متّقی شخص لوگوں کی نظر میں گرنا قبول کر لیتا ہے لیکن اللہ کی نظر میں گرنا اور بے عزت ہونا قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر وہ اللہ کی نظر میں گر جائے گا، تو وہ اپنی انسانی فضیلت (human dignity) کھو بیٹھے گا۔ اپنا تشخص، عزتِ نفس (self respect) سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے گا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے جب اللہ کی نظر میں بلند مقام حاصل کرنے کی فکر چھوڑ دی، تو وہ اللہ کی نظر سے گر گئی نتیجتاً وہ اپنی بھی عزّت گنوا بیٹھی۔ لہذا آج کے انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر عیب، ہر برائی کو آگے بڑھ کر اپنا لیتا ہے بلکہ دلیل بھی دیتا ہے کہ انسان تو ہے ہی گندہ، گناہوں کی پوٹ اور انسان کے جینیات (genes) کے اندر ہی گندگی ہے، انسان خود اپنے ہی آپ کو برا سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن متّقی اللہ کی نظروں سے نہیں گرنا چاہتا۔ اور یہ واقعی بڑا بھاری اور مشکل قدم ہوتا ہے کہ

---

(۱) مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ماعمل...

انسان اللہ کی خاطر لوگوں کی نظروں میں گرنا قبول کر لے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے، اور اس کیلئے اپنی شخصیت میں ایک چیز درکار ہے اور وہ ہے اپنے اوپر حد درجے کا اعتماد۔ اپنے شرف کا، اپنے مقام کا احساس، پُر اعتماد لوگ ہی یہ فیصلہ (choose) کر سکتے ہیں۔ جس میں ذرا بھی اعتماد کی کمی ہو وہ یہ راہ کبھی بھی اختیار نہیں کر سکتے کہ خواہ لوگوں کی نظر میں گر جائیں لیکن اللہ کی نظروں میں اپنا مقام برقرار رکھیں۔ یہ اعتماد تقوی سے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبودیّت میں حریّت ہے، جب ''انا'' اللہ کی غلام بن جائے تو انسان لوگوں کے معیار اور انکی آراء اور تنقید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور اگر انائے صغیر انائے کبیر کے آگے نہ جھکے تو مختلف اخلاقی اور روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اور جب اپنا مقام یاد نہیں رہتا تو پھر اپنا مقصد بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذریات:۵٦) ''میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں''۔ لیکن جب انسان کو اپنا مقام اور مقصدِ حیات یاد نہیں رہتا تو انسان جانوروں کی غلامی شروع کر دیتا ہے یا پھر مظاہر قدرت کو سجدے کرنے لگتا ہے۔ اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے ان سے دنیا کا خریدار بن جاتا ہے، اس کا رویّہ غیر متوازن (disbalance) ہو جاتا ہے اور پھر اس کے خالق سے بھی اور مخلوق سے بھی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔

انا میں اعتدال:

جس طرح انا کو حد سے گرانا پسندیدہ نہیں۔ اسی طرح انا کو حد سے بڑھانا بھی انتہائی خطرناک ہے۔ مومن کی انا چونکہ اپنے صحیح مقام پر اور حد کے اندر ہی رہنی چاہئے چنانچہ وہ اپنی انا (ego) کو درست مقام پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا مومن باادب ہوتا ہے، اس کا رویہ (attitude) درست ہوتا ہے، اس کے اخلاق (etiquette) صحیح ہوتے ہیں لیکن اگر انا حد سے بڑھ جائے تو بے ادبی لازماً پیدا ہوتی ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور اس بے ادبی کی وجہ اس کی انا تھی، اسی انا نے ابلیس کو رجیم بنایا، اسی انا نے ''عزازیل'' کو ''ابلیس مردود'' بنا دیا۔ جب رب تعالیٰ

نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو پہلا لفظ اس کی زبان پر ''انا'' آیا ﴿اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ﴾ (الاعراف: ۱۲) ''میں اس سے بہتر ہوں''۔ انسان جس کو بڑا سمجھتا ہے، مشکل اور پریشانی میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پر جب مشکل پڑی تو ان کی زبان پر اللہ کا نام آیا لیکن شیطان کی زبان پر لفظ ''انا'' آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نظر میں اللہ سب سے بڑا تھا۔ ان کی انا اللہ کے آگے جھک چکی تھی لیکن شیطان کی انا نہیں جھکی۔ اس نے حکم عدولی کی، نافرمانی کی، بدتمیزی اور بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور کہا ﴿اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ﴾ (الاعراف: ۱۲) ''میں اس سے بہتر ہوں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا بادشاہ جس کا نام نمرود تھا۔ اس کے سامنے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا ذکر کیا تو اس نے بھی کہا ﴿قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ﴾ (البقرۃ: ۲۵۸) ''میں زندگی دیتا ہوں، اور میں موت دیتا ہوں''، میں ہی سب کچھ ہوں جب انسان میں انا زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ تکبر والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ فرعون نے تو سارے ریکارڈ توڑ دیے، تکبر کی تمام حدود پار کر گیا۔ اس نے دعویٰ کیا ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ (النزعت: ۲۴) ''میں ہوں تمہارا سب سے اعلیٰ رب'' اس تکبر نے اس کو برباد کیا، اسی نے اس کو ڈبویا، نشانِ عبرت بنا دیا۔ تو انا کو قابو (control) کرنا نہایت ضروری ہے، حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائے، حد سے بڑھے گی تو تکبر پیدا ہوگا اور انسان کبھی جنت حاصل نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف حد سے زیادہ گھٹ جائے گی تو دنیا میں ناکارہ اور بیکار ہو جائے گا، خالق و مخلوق کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہئے، وہ انا ہی متعین (determine) کرے گی۔ اگر انا اپنے مقام پر ہے تو مومن باادب ہوگا۔ خالق کو خالق کا حق اور مقام دیگا اور مخلوق کو مخلوق کا حق اور مقام دیگا اور اگر انا اپنے مقام سے بڑھ گئی ہے تو پھر وہ بے ادب ہو جائے گا نہ اللہ کی تعظیم کریگا، نہ مخلوق کی عزت کریگا۔ اور اگر یہی انا اپنے مقام سے گھٹ گئی تو پھر اس کی اپنی نظروں میں بھی عزت نہ رہے گی۔